اُردو کے تیرہ افسانے

اُردو کے بہترین افسانوں کا

لاجواب اِنتخاب

اُردو کے مشہور افسانہ نگار

پریم چند   کرشن چندر   غلام عبّاس   راجندر سنگھ بیدی
سعادت حسن منٹو   عصمت چغتائی   حیات اللہ انصاری   ممتاز مفتی
اے۔حمید   اشفاق احمد   انتظار حسین   قرۃ العین حیدر
احمد ندیم قاسمی

اردو کے تیرہ افسانے

مرتبہ

اطہر پرویز (ڈاکٹر)

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کنگ پبلشرز
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۴۳ کراچی

سول ایجنٹ،

ممتاز پبلشرز

۲۰۔ نوشین سینٹر۔ اُردو بازار۔ کراچی

جُملہ حقوق محفوظ ہیں

طباعت ———————————— ناظر پریس

تعداد ———————————— پانچ سو

قیمت Rs: 60.00

پروفیسر شوکت علی سلطان کے نام

جنھوں نے اپنی برادرانہ محبت اور رفیقانہ
خلوص سے مجھے ماریشس کے دوران قیام
میں ذرا بھی اجنبیت نہ محسوس ہونے دی۔
آج تین ہزار میل کے فاصلے سے جب میں ان
کو یاد کرتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ گویا ــــ ع
یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ

اطہر پرویز

ترتیب

پیش لفظ ——— اطہر پرویز ——— ۷

کفن	پریم چند	۱۷
مہالکشمی کا پُل	کرشن چندر	۲۷
آنندی	غلام عباس	۴۶
اپنے دکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	۶۵
رئیس خانہ	احمد ندیم قاسمی	۹۸
ٹوبہ ٹیک سنگھ	سعادت حسن منٹو	۱۵۱
چوتھی کا جوڑا	عصمت چغتائی	۱۶۱
آخری کوشش	حیات اللہ انصاری	۱۷۹
آپا	ممتاز مفتی	۲۱۲
منزل منزل	اے حمید	۲۲۷
گڈریا	اشفاق احمد	۲۷۲
آخری آدمی	انتظار حسین	۳۲۴
نظارہ درمیان ہے	قرۃ العین حیدر	۳۳۵

پیش لفظ

کسی نے کہا تھا کہ فکشن ہم کا کام دراصل جھوٹ کہنے کے فن کی مشق ہے، لیکن اس مشق نے
ۂ گویوں کے قلم سے کتنے زندہ جاوید فن پارے تخلیق کروائے کہ ان میں ہمیں انسانی نفسیات کے
یچ وخم کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، کتنی فلسفیانہ گرہیں کھلتی نظر آئیں ـــــ ادب دراصل ایک
ستعارہ ہے۔ یہ استعارہ ادب کی ہر صنف کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے۔ افسانہ بھی اسی طرح
ب استعارہ ہے۔ یہ استعارہ ہے زندگی کا ـــــ گروہوں کا اور افراد کے ذہنی اور جذباتی ردعمل کا۔
ی لئے ان کی نفسیاتی اور سماجی زندگی سے دلچسپی اور ان پر غور وفکر ـــــ افسانے کا ایک اہم حصہ ہے۔
افسانہ ایک ایسی پُر فریب فضا تیار کرتا ہے جو ایک طرح سے حقیقی ہوتی ہے حالانکہ وہ بظاہر
نے افسانے کا تار وپود حقیقت سے زیادہ فریب اور سچ سے زیادہ جھوٹ سے تیار کرتا ہے لیکن دراصل
اقعیت اور حقیقت کا اظہار ہے۔ یہاں جھوٹ کے مقابلے سچ کا بول بالا ہے۔ کہانی کہنے والا کچھ
ں انداز سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا ایسے تجربے سے گذرتا ہے جس میں اسے ایسے افراد اور ان سے
علق واقعات کو یقین کرنا پڑتا ہے جن کا نہ تو کوئی وجود تھا اور نہ واقعات اس ترتیب اور اس شکل
ں کہیں پیش آئے تھے لیکن پڑھنے والے کا ردعمل کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے جیسے وہ افراد فی الواقعی
ی قسم کے تھے اور وہ واقعات ان کی زندگی میں پیش آچکے ہیں۔ دراصل افسانہ نگار یہاں ایسا پس
پیش کرتا ہے، جو اتنا حقیقی معلوم ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن کو اسے قبول کرنے میں ذرا بھی جھجک
ہوتی۔

مختصر افسانہ، ادب کا سب سے چھوٹا بچہ ہے۔ اور ہر زبان میں اس کو یہی حیثیت حاصل ہے
صحت مند اور ہونہار ہونے کی وجہ سے بہتوں کو یہ غلط فہمی بھی ہوئی کہ اس کا تعلق ناول سے ہے۔
لوگوں نے تو یہی سمجھا کہ اگر کسی ناول کو مختصر طور پر بیان کر دیا جائے یا صرف اس کا پلاٹ لے لیا جا!

تو وہ مختصر افسانہ بن جائے گا یعنی دوسری طرف یہ بھی کہ افسانہ کو تفصیلات کے ذریعہ پھیلا دیا جائے تو وہ ناول ہو جائے گا لیکن یہ بیان اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ کہنا کہ افسانہ مختصر ہوتا ہے اس لئے اس کا لکھنا ناول کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔

ناول میں ناول لکھنے والا کوئی گوشہ تاریکی کے لئے نہیں چھوڑتا لیکن افسانے میں بجا بجا کھانچے نظر آسکتے ہیں۔ افسانہ نگار ان کو چھوڑتا جاتا ہے اور اس طرح اپنے پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت بھی کرنا چاہتا ہے۔ یہاں عام طور پر کہی باتوں سے زیادہ ان کہی کی اہمیت ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ کا استعمال کرے۔ وہ لفظوں سے زیادہ احساسات سے اپنے افسانے کو نمایاں کرے۔ عام طور پر لوگ لفظوں کے ذریعہ نہیں سوچتے۔ انسان کے ذہن میں خیالات اور تصورات پہلے آتے ہیں اور پھر وہ ان کو لفظوں کا لباس پہناتا ہے۔ افسانہ ایک خیالی پیکر کی عملی تشکیل ہے۔ اسی لئے یہاں احساسات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ بات سننے میں تو عجیب سی لگتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو کچھ نہیں کہا جاتا، انسانی تجسس اسے تلاش کرتا ہے۔ ممتاز مفتی کی "آپا" ایک لفظ نہیں بولتی لیکن اس کی خاموشی ہی اس کی گفتگو ہے۔ وہ سرتاپا جذبات سے سرشار ہے لیکن اس کے اظہار کو گناہ سمجھتی ہے۔ وہ خاموشی سے چنگاری کو بھی بجھا دیتی ہے کہ یہ ہلکی سی چنگاری جو راکھ میں چھپی ہوئی تھی، دکھائی دیتی ہے۔ "آپا" کو ہم بہت قریب سے جاننے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے ہیں۔ سچ ہے کہ کردار نگاری محض لفظوں کے پل باندھ کر نہیں کی جاتی۔ اسی لئے افسانے کا فن مشکل فن ہے۔

مختصر افسانہ لفظوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ ہر افسانہ اپنے گنتی کے الفاظ رکھتا ہے۔ افسانے کا فن اس بات کا متقاضی ہے کہ افسانہ نگار دریافت کرے کہ افسانے پر کتنے لفظوں کا بوجھ رکھا جا سکتا ہے۔ ایچ۔ ای۔ بیٹس نے اپنی کتاب "دی ماڈرن شارٹ اسٹوری" میں دوبارہ یہ بات کہی ہے کہ کہانی لکھنا گویا دیا سلائی کے تنکوں سے عمارت بنانا ہے اور اس عمل میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب کہ ایک مزید تنکا اٹھا اڑا دھم کر کے سب کو گرا سکتا ہے۔ اس لئے افسانہ نگار کو اس بات کا شدت سے احساس ہونا چاہئے کہ کس وقت اس کی بات پوری ہو گئی اور اب کہاں بس کر اپنا قلم روک دینا چاہئے۔ افسانے میں ایک قسم کی وحدت ہوتی ہے اس لئے یہاں جملوں

سے لے کر الفاظ تک کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی بات غیر ضروری نہ کہی جائے جو زبان لکھی جائے وہ افسانے کی مناسبت سے ہو اور اس فضا کو پوری طور پر ظاہر کرے۔ اظہار کا سب سے بہتر ذریعہ زبان ہے اور زبان صرف الفاظ کا نام نہیں ہے۔ زبان میں لب و لہجہ اور طرز ادا سب ہی کچھ شامل ہے۔ اس لئے افسانہ نگار کو الفاظ کے انتخاب میں غیر معمولی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

مختصر افسانہ جادو کی بوتل نہیں ہے جس میں دیوزادوں کو دھوئیں کی شکل میں مقید کیا جاسکے۔ اس میں کردار یا مختلف کرداروں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ پھر بھلا جھلکیوں میں کرداروں کا ہر روپ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں زندگی میں کتنے انسان نظر آتے ہیں اگر ہم انھیں مختلف صورت حال میں دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ان کو مختلف زاویوں سے دیکھنا ہوگا کسی ایک ؎ ان کا ایک ہی روپ نہیں ہوتا۔ وہ بیک وقت بیٹا، شوہر اور باپ بھی ہوتا ہے۔ وہی کارخانے اور دفتر میں کام کرتا ہے۔ وہ افسر بھی ہوسکتا ہے اور ماتحت بھی۔ وہ مقروض بھی ہوسکتا ہے اور کسی کو قرض بھی دے سکتا ہے۔ وہ ایک کا دوست اور دوسرے کا دشمن بھی ہوسکتا ہے۔ وہ فرد کی حیثیت سے منفرد ہے لیکن اس کے روپ علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مختصر افسانہ اس کردار کا ایک آدھ ہی روپ پیش کرسکتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ مختصر افسانے میں ایک آدھ کردار ہی پیش کیا جائے۔ یہاں کئی کردار بھی ہوسکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو واقعات پیش کئے جائیں وہ بہت مختصر وقفے کے اندر ہوں۔ یہ واقعات برسوں پر محمول ہوسکتے ہیں لیکن ان کرداروں سے متعلق واقعات یا ان واقعات سے متعلق کردار چاہے تعداد میں کتنے ہی ہوں اور کتنے ہی برسوں پر پھیلے ہوں وہ ایک ہی مرکزی خیال پر روشنی ڈالیں۔

مختصر افسانہ کوئی دستاویز نہیں ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ یہاں تخیل کے ذریعہ تصویریں بنائی جاتی ہیں لیکن اس کے لئے افسانہ نگار میں دور تک دیکھنے کی صلاحیت ہونا چاہئے تاکہ ہم کرداروں کو آر پار دیکھ سکیں۔ یہ بات کرداروں کے ذریعہ اس طرح پیدا کی جاسکتی ہے جیسا کہ اشفاق احمد کے گڈریا میں۔

یہ حقیقت ہے کہ ادب پہلے تخلیق ہوا، اس کے بعد تنقید وجود میں آئی۔ کیونکہ تخلیقی ادب کے بغیر تنقید کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ادب ہی سے تو معیار کا تعین ہوتا ہے۔ اسی بات کو ہم افسانے کی تنقید میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہم محض تنقید کے ذریعے افسانے کے فن کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے کہ کوئی بھی تنقیدی اصول افسانوں کے فن کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ اگر ہم مختلف قسم کے افسانے پڑھیں تو ہم

نتر طور پر افسانے کے فن کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہر افسانے کی اپنی تکنیک اور اس کا اپنا فن ہوتا ہے اور
ن کی دریافت افسانہ نگار کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اگر افسانہ نگار کے قدم یہاں پر ڈگمگا جائیں تو
یا افسانہ اپنی پیدائش سے پہلے ختم ہو گیا۔ اس لئے افسانے کو وجود میں لانے کے لئے افسانہ نگار کو اپنا
ن جگر پلانا پڑتا ہے۔ وہ واقعات جو اس ترتیب اور اس نوعیت سے کسی کی زندگی میں پیش نہیں آتے،
ہیں اپنے اوپر گذارنا پڑتا ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ تخلیق کے ایک مسرت ناکرب سے گذرنا پڑتا ہے۔

افسانہ نگار کو اپنے اس مخصوص افسانے کے اسلوب کو بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اسے اسلوب پر
ن اتنی ہی توجہ دینا چاہئے جتنی کہ خام مواد پر — اس اسلوب کے اندر لچک ہونا چاہئے کہ ضرورت
مطابق اس کو موڑا جاسکے۔ افسانے کا خام مواد پلاسٹر آف پیرس کی طرح ہوتا ہے۔ اب اس سے
یسا مجسمہ بنتا ہے یہ افسانہ نگار پر منحصر ہے۔

افسانہ میں واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں انسان تو ہوتے ہی ہیں لیکن یہ ضروری
نہیں کہ ہر افسانے میں ان کی صحیح معنوں میں کردار نگاری کی جائے۔ اس سے افسانے میں کوئی فرق نہیں
پڑتا۔ مثال کے طور پر غلام عباس کی کہانی "آنندی"۔ اس افسانے میں کوئی خاص کردار نہیں محض
فراد کا ہجوم ہے جو عقائد بھی رکھتے ہیں اور معاشرے کا جبر بھی۔ ان کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے
یکن ان کو ایک افسانہ نگار کی نظر سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ اور وہ لوگ جو یہاں اقدار کے پاسبان
ظر آتے ہیں وہ سب کے سب اس حمام میں ننگے دکھائی دیتے ہیں۔ "آنندی" اسی لئے ایک مثالی کہانی
ہے ہر اچھی کہانی مثالی کہانی ہوتی ہے کیونکہ اس میں وہ بات ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں ہوتی۔

بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ افسانے کا فن اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ تبلیغ کا بوجھ برداشت نہیں
کر سکتا لیکن اگر ہم "مہالکشمی کا پل" کے علاوہ بھی کرشن چندر کے افسانے پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہی تبلیغ
کرشن چندر کے افسانے کے فن کی جان ہے۔ 'روایت' کی خوبی یہ ہے کہ راوی نظر نہ آئے لیکن کرشن چندر کے
یہاں راوی محض جھانکتا ہی نہیں بلکہ خود بھی اچھل کر سامنے آجاتا ہے۔ 'بالکونی' میں جب بوڑھا عبداللہ
مرجاتا ہے اور منیجر صاحب پکارتے ہوئے گالی دیتے ہیں تو راوی کہتا ہے۔

"بول۔ بول۔ اے سور کے بچے! سپید سپید پتلیوں والے غلیظ بڈھے، گنجی چاند
والے، کھردرے ہاتھ پاؤں والے نیم برہنہ فاقہ مست انسان، بول، کیا مر کر بھی تجھے

نگا کی کا جواب دینا آئے گا۔"

کرشن چندر کے بہترین افسانے وہی ہیں جہاں انھوں نے تبلیغ کو فنی ہیئت دی ہے اور اسے اپنا اسلوب بنالیا ہے۔ کرشن چندر نے اپنے زمانے کی روح کو اپنے افسانوں میں اسیر کرلیا ہے۔ ان کے افسانوں سے ان کے عہد کے ہندوستانی سماج کی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کی یہ خصوصیت نہ صرف ماحول، پس منظر اور زندگی کی کشمکش سے واضح ہوتی ہے بلکہ وہ کرداروں سے بھی خوب کام لینا جانتے ہیں۔ کردار کے افسانے اپنے مصنف سے بڑا زبردست مطالبہ رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ دراصل وہ کردار ہی بذاتِ خود افسانے ہوتے ہیں۔ اس کا فن اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو کس حد تک زندگی اور زندہ انسانوں سے قریب کرتے ہیں۔ کرداروں کو جانچنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ وہ کس حد تک زندگی سے میل کھاتے ہیں۔

کردار چاہے کتنے ہی انوکھے کیوں نہ ہوں لیکن پڑھنے والا ہر لمحہ یہ محسوس کرے کہ وہ اسی معاشرے کے اندر سانس لے رہا ہے۔ افسانے انسانی تجربات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ افسانہ انسان اور اس کے سماج کے اردگرد چکر لگاتا ہے۔ اس لئے وہ سماج کے مسائل سے کترا کر نہیں نکل سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ افسانہ نگار اپنے مخصوص زاویئے سے اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانہ واقعیت کا اظہار ہے جسے ہم شاعرانہ حقیقت بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شاعرانہ حقیقت افسانے کے ذریعہ بڑی کامیابی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں بظاہر ہر چیز فرضی ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نام اور مقام کے علاوہ کوئی چیز بھی فرضی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہ تمام واقعات زندگی کے اپنے دیئے ہوتے ہیں۔ وہ واقعات چاہے اس شکل میں نہ پیش آئے ہوں لیکن اس کا تجربہ انسانی معاشرے کا تجربہ ہے۔ یہ تجربہ افسانہ نگار کے یہاں جتنی سچائی اور شدت کے ساتھ پیش آئے گا افسانے کی تکنیک اس کو اسی انداز سے اپنے اندر جذب کرلے گی۔

ابتدائی افسانہ نگاروں کے سامنے یہ مشکل ضرور پیش آئی ہوگی کہ افسانہ اتنا مختصر ہے کہ چند صفحات کے اندر کردار کے ساتھ کس طرح انصاف کیا جاسکتا ہے لیکن افسانہ نگاروں نے بہت جلد اپنی چابکدستی سے ثابت کر دیا کہ اگر افسانہ نگار کی قوتِ تخیل چاہے تو جزو میں کل کو بھی بڑی کامیابی سے پیش کرسکتی ہے۔ البتہ افسانہ نگاروں کو اپنے کرداروں سے ذہنی طور پر ضرور مانوس ہونا چاہئے۔

چیخوف کی "ڈارلنگ" اپنی پوری شخصیت کے ساتھ افسانے میں نظر آتی ہے۔ اس کی محرومی، اس کا زندگی سے سمجھوتہ، ہر شکست کو فتح سے بدلنے کا جذبہ اور ان گنت احساسات اس بڑے کردار کا سرمایہ ہیں۔ منٹو کے افسانے "نیا قانون" کا "استاد منگو"، ممتاز مفتی کی "آپا"، کرشن چندر کا "موبی" اور "کالو بھنگی"، اشفاق احمد کا "گڈریا"۔۔۔ بیدی کے "اپنے دکھ مجھے دے دو" کی "اندو"، ہاؤسنگ سوسائٹی کا جمشید، سلمیٰ اور ثریا اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

بعض لوگ مختصر افسانے کے کرداروں سے بڑی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ دراصل مختصر افسانے میں ہمارے سامنے کردار کا پورا ارتقا نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ارتقا ہوتا بھی ہے تو اشاروں اور کنایوں ہی میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں اس کی ضروری کمی رہ جاتی ہے وہاں قاری کا ذہن اسے پورا کر لیتا ہے۔ یہاں کردار قد سے نہیں، انداز قد سے پہچانے جاتے ہیں۔ زندگی کی طرح افسانوں میں بعض دفعتاً ایسے کردار ملتے ہیں جو ایک ہی جھلک میں اپنی پوری شخصیت کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔

عصمت چغتائی کا افسانہ "چوتھی کا جوڑا" ایک معاشرے کا درد و کرب ہے۔ یہاں عصمت کرشن چندر کی طرح تبلیغ نہیں کرتیں، لیکن وہ چپ چاپ ایک کیمرا لئے ہوئے کبریٰ کی ماں کے گھر میں پہنچ جاتی ہیں اور ان تمام ان کہی باتوں کی تصویر کھینچ لیتی ہیں، جنھیں کبریٰ کی ماں سوچتی ہے کہتی نہیں۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ وہاں کوئی اور بھی ہے تو وہ اپنا سر پیٹ لے۔ معاشرے کا جبر بھی عجیب ہوتا ہے کہ انسان کبھی کبھی اسے اپنے آپ سے بھی نہیں دہرا سکتا۔ یہاں تک کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اس کے لئے کلمۂ کفر کے مترادف ہے کیوں کہ یہاں سوچنے پر بھی تو پہرے ہیں۔ عصمت صرف کہانی لکھ دیتی ہیں، فیصلہ صادر نہیں کرتیں۔ اگر وہ رائے زنی کرتیں یا راوی کا انداز اختیار کرتیں تو ہم یقیناً انھیں اذیت پسند بھی کہتے۔

افسانے کے لئے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ اس لئے کہ زندگی کے اندر اتنے موضوعات بکھرے پڑے ہیں کہ ان کو سمیٹا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ جب ہم افسانے کے فن پر غور کریں تو ہمیں موضوع کی اہمیت کی طرف نہ دیکھنا چاہئے۔ چیخوف نے صحیح کہا تھا کہ وہ کسی چیز پر بھی افسانہ لکھ سکتا ہے۔ تکنیک تو موضوع کے اندر ذہنی ربط پیدا کرنے کا نام ہے۔ افسانہ نگار کو یہاں افراط و تفریط سے کام لینا چاہئے اور اس پر خوب محنت کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ایک موضوع

بلکہ ایک ہی واقعہ کو مختلف افسانہ نگار الگ الگ طریقے سے بیان کر سکتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ موضوع اپنی ہیئت تو تلاش کرتا ہے لیکن ہیئت کوئی ایک نہیں ہو سکتی۔ اس کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ اسی کو لوگ افسانے کا پلاٹ کہتے ہیں۔ اس سے افسانے کو ایک طرح کی فنی تنظیم ملتی ہے۔ واقعہ کو ترتیب حاصل ہوتی ہے اور یہ ترتیب ہی قصے کو آگے بڑھاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو واقعات سے قصے کا عنصر ختم ہو جائے۔ اس کی بدولت مرکزی خیال بھٹکتا نہیں۔ مرکزی خیال کو بہر حال افسانے میں مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی افسانہ لکھنے کا محرک ہوتا ہے۔ بقول وزیر آغا "ہر افسانے کا ایک نقطہ ہوتا ہے اور افسانے کے تمام واقعات اسی ایک نقطے کو ابھارنے کے لئے وقف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک اچھے افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر واقعہ تاثر، بلکہ ہر جملہ ایک ہی مرکزی نقطے کی تعمیر میں صرف ہوتا ہے۔"

اردو افسانہ ہندستان کے بدترین اقتصادی دور کی پیداوار ہے۔ معاشرے میں تیزی سے تبدیلی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے اردو افسانے نے اپنی نظریں خوب اچھی طرح ان مسائل کی طرف گاڑ دیں اور ان کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا افسانہ زندگی کی تصویر ہی نہیں بلکہ تعبیر بھی ہو گیا۔ آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی، اشتراکیت کے نعرے فضا میں گونجنے لگے، اردو افسانہ ہندستان کی اسی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ بچوں میں ماحول کو قبول کرنے کی صلاحیت بڑوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ یہ اردو افسانے کا بچپن تھا اس لئے اس نے لازماً اپنے عہد کی تمام تر صفات کو بڑی تیزی سے قبول کر لیا۔ پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں نے زندگی کے ہنگامی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ چاہے بنگال کا قحط ہو، یا ہندو مسلم فساد ہو، یا کوئی اور ہنگامی مسئلہ ہو ــــ ان تمام افسانہ نگاروں نے اپنے سیاسی شعور کی بنا پر افسانے میں مقصدیت کو نمایاں کیا۔ ان کی بدولت پڑھنے والوں کا حلقہ بڑی تیزی سے بڑھتا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں ایک غیر معمولی کشش تھی۔ یہ اپنے پڑھنے والوں کو شدت سے متاثر کرتے تھے۔ انھیں اپنا ہم خیال بنا لیتے

تھے۔ کم ازکم اس مخصوص کہانی میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے اردو افسانوں پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی چھاپ آج بھی گہری ہے اور اردو کے نئے افسانہ نگار چاہے بالواسطہ ہی سہی، لیکن ان سے متاثر ضرور ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی نسل کو تو متاثر کیا ہی تھا لیکن نئے لکھنے والوں کی نسل ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس میں عہد کا بھی ہاتھ تھا اور زندگی کے حقائق بھی مجبور کرتے تھے کہ فن کار اس طرف متوجہ ہو۔ ایسا نہیں تھا کہ فرد کی طرف توجہ نہ دی گئی ہو لیکن فرد بہر حال ایک معاشرے کا حصہ ہوتا ہی ہے اور جب معاشرے کا یہ حال ہو، جو اس زمانے میں تھا تو پھر افسانہ نگار کا کام بھی نسبتاً آسان تھا۔ وہ بہت کچھ تو بغیر کسی مزید رنگ آمیزی کے پیش کر دیتا تھا اور یہ قاری کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھا۔ ادب میں حقیقت پسندی کسی چور دروازے سے نہیں بلکہ صدر دروازے سے داخل ہوئی ہے اس کا خاطر خواہ خیر مقدم ہوا۔ مختصر افسانہ ابتدا ہی سے تاریخ کے ادبی تقاضوں سے پورے طور پر ہم آہنگ تھا۔ اس کے بعد پھر اس میں موضوعات کا تنوع ہوا۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی عوامل اس پر برابر اثر انداز ہوتے رہے۔ تقسیم ہند نے ایسے سیاسی مسائل پیش کئے جن کے اثرات نہ صرف سیاسی حد تک محدود رہے بلکہ اس نے معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات بھی ڈالے چنانچہ اردو افسانہ ان سے متاثر ہوا۔ منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، اشفاق احمد وغیرہ نے اپنے افسانوں سے لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ممتاز حسین کا افسانہ "سورج سنگھ" اردو کے افسانوی ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا حالانکہ ممتاز حسین بنیادی طور پر ایک نقاد تھے لیکن انھوں نے سورج سنگھ لکھ کر اردو افسانوی ادب میں ایک گراں بہا اضافہ کیا۔ اس کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں کا قلم کچھ سست پڑ گیا۔ کرشن چندر نے بازار کے رخ کو دیکھ کر افسانے لکھے لیکن اس کے باوجود وہ ہر سال چند اعلیٰ درجے کے افسانے ضرور لکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی طرف نقاد زیادہ توجہ نہیں دیتے اور ان کے بارے میں اپنی رائے بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ میں اس موضوع پر پھر کسی اور وقت لکھوں گا۔

اب میں اس مجموعے کے بارے میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل یہ مجموعہ اردو افسانے کا تیس سالہ انتخاب ہے۔ اس میں میں نے افسانہ نگاروں سے زیادہ افسانوں پر توجہ دی ہے اور اسی بنا پر بہت سے اچھے افسانہ نگار اس بزم میں شریک نہیں ورنہ جی تو میرا بھی چاہتا تھا کہ بلونت سنگھ، شوکت صدیقی، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، حسن عسکری، اختر انصاری، ابوالفضل صدیقی جیسے اچھے افسانہ نگار بھی اس مجموعے میں شریک ہوتے۔

میں نے عالمی معیاروں کی کسوٹی پر افسانوں کو پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اسی لئے مجھے بعض افسانہ نگاروں کو چھوڑنا بھی پڑا۔ میرے پاس صفحات بھی محدود تھے اس لئے بعض اچھے افسانے شریک اشاعت نہ کئے جاسکے جس کا مجھے افسوس ہے۔ پھر یہ خیال بھی رہا کہ ایک افسانہ نگار کا ایک سے زیادہ افسانہ نہ آنے پائے ورنہ اس مجموعے میں الحمدللہ گنڈاسا، نیا قانون، موذیل، بابو گوپی ناتھ، کالی شلوار، بالکونی، کالو بھنگی، موبی، زندگی کے موڑ پر، ان داتا، جلاوطن، سیتا ہرن، لاجونتی، بھولا، گرم کوٹ، نانی کی نانی، پرمیشر سنگھ، اس گھر سے اس گھر تک، گرم کوٹ، آخری موم بتی، اجودھیا وغیرہ جیسی کہانیاں ضرور شامل ہوتیں۔ یہ افسانے نہ صرف عالمی معیاروں پر پورے اترتے ہیں بلکہ انھیں دنیا کے بہترین افسانوں کے پہلو بہ پہلو رکھا جاسکتا ہے۔ انھیں وہ مقام حاصل ہے جو ٹالسٹائی کی فیملی ہیپی نس، کوسک؛ موپاساں کی بولے دے سوف، نیکلس، مودموازیل فی فی؛ چیخوف کی ڈارلنگ، دی اسٹیپی، دی پارٹی، وارڈ نمبر ۶ اور اسکول مسٹرس؛ او ہنری کی گفٹ آف میجائی، لاسٹ لیف؛ سامرسٹ ماہم کی "رین" اور گالز ودی کی کوالٹی جیسی کہانیوں کو حاصل ہے۔ اس مجموعے میں جو افسانے شامل ہیں انھیں اردو کے نمائندہ افسانے کہا جاسکتا ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جو نام میں نے گنائے ہیں یہی اردو افسانے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اردو افسانوی ادب کا خزانہ بڑا مالامال ہے۔

میں ڈاکٹر محمد حسن کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ "یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ آج مختصر افسانہ اردو نثر کا سب سے ترقی یافتہ فارم ہے اور اس کی بدولت اردو نثر کہیں سے پہنچ گئی ہے۔"

میں نے اردو کے بالکل نئے افسانوں کو جو جدید تر نسل سے متعلق ہیں، جان بوجھ کر اس انتخاب سے الگ رکھا ہے۔ میں اس کا انتخاب دوسری جلد میں پیش کروں گا۔ اس میں صرف اشارے کے طور پر "آخری آدمی" شامل کیا ہے تاکہ قاری کو اردو افسانے کے بدلتے ہوئے رجحان کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ اس کو اس مجموعے کا آخری افسانہ سمجھنا چاہیے۔

اس زمانے میں افسانوی ادب سے بے نیازی برتی جا رہی ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ افسانوں کے مجموعے بازار میں نہیں ملتے۔ مجھے امید ہے کہ یہ انتخاب افسانوی ادب سے بے توجہی کو شاید کچھ کم کر سکے اور ہم اردو افسانے کا بغیر کسی جھجک کے مطالعہ کریں۔

اطہر پرویز

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۱۵ر فروری ۱۹۷۶ء

پریم چند

کفن

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ
سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ
پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اور رہ رہ کر اس کے منھ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی
دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں
ئی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر
آؤں ؟"

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا
ساتھ اتنی بے وفائی ؟"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو

تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس ل
انھیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھ
جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھ
بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے۔ جب
فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام
کی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں
لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پاکر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہو
کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لئے ضبطِ نفس کی مطلق ضر
نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی۔ گھر میں مٹی کے دو
برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے، دنی
فکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین
کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر
کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے، یا دس پانچ
توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کا
اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ بلکہ اس
اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے
جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گ
مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندا
تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظ
اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں
بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلا

بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مرجائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا: "جاکر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھساد ہوگا۔ اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے کس کے گھر سے آئے؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کردے گا۔ بولا: "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا ہے میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تم ہی جاکر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں۔ اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منھ نہیں دیکھا! آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں اسے تن کی سُدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔"

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہوگیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آئے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو —— جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلاکر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی، اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا۔ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز

جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین وادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اُسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی۔ اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منھ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا۔ اس لئے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی۔ جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا۔ وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ سب کو — چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ ایک رسے دار ترکاری دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہئے۔ پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں

گروہ ہیں کہ دیے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منھ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی، کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جاکر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر"۔

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا کہ "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا"۔

"اب کوئی کیا کھلائے گا وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھوگے! مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے"۔

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی"۔

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں"۔

"میں پچاس کھا جاتا"۔

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے"۔

آلو کھاکر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جاکر دیکھا۔ تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منھ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقعہ نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسا چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمینداروں کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں، وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا۔ کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔" سرکار بڑی بپت میں ہوں، مادھو کی گھر والی رات گزر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا مگر وہ ہمیں دغا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک تباہ ہو گئے، گھر اُجڑ گیا۔ آپ کا غلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اُٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہوگی تو اس کی مٹی اُٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟"
زمیندار صاحب رحمدل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں۔
"چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپئے نکال کر پھینک دیئے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکلا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں، گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپیہ دیئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈھورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے۔ کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپئے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دیا اور کسی نے لکڑی، اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے

ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔
گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ آکر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر
دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا" لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو!
مادھو بولا" ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہیئے۔"
" تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔"
" ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔"
کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر
نیا کپھن چاہیئے۔"
" کپھن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔"
" اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"
دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں
ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک
شراب خانے کے سامنے آپہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ اور
ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب
کی لی۔ کچھ گزک، اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔
کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔
گھیسو بولا" کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آ کھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"
مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔
" دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں کیوں دے دیتے ہیں۔ کون دیکھتا

ہے پرلوک میں ملتا ہے کہ نہیں!"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے!"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دوگے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ کفن کہاں ہے؟"

گھیسو ہنسا۔ "کہہ دیں گے کہ روپیہ کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا "بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن۔ اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپیہ خرچ ہو گئے صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہوگا۔"

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ "جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان تم انترجامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

"کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی!"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا "جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کفن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے!"

"کہیں گے تمھارا سر۔"

"پوچھے گی تو جرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دُنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپئے تو تم نے چٹ کر دیئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔" میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں۔"

"کون دے گا بتاتے کیوں نہیں۔"

"وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپیہ ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پیئیں گے۔ اور کپھن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا۔ اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی۔ مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا کوئی لہکتا تھا۔ کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منھ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ، کتنے تو چلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آئے تھے صرف خود فراموشی کا مزا لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ درگور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزالے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتّل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا۔ جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "دینے" کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔" لے جا۔ کھوب کھا اور اسیر باد دے جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی۔ مگر تیرا اسیرباد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیرباد دے بڑی گاڑھی کمائی

کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: "بیکھنڈ میں جائے گی دادا — بیکھنڈ کی رانی بنے گی۔"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا: "ہاں بیٹا بیکھنڈ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکھنڈ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں۔ اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں۔ اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا۔ تلوّن نشے کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔

مادھو بولا:۔

"مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی تو کتنا دکھ جھیل کر۔"

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا: "کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھُس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا میخانہ محوِ تماشا تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی۔ کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

کرشن چندر

مہالکشمی کا پل

مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار مہالکشمی جی کا ایک مندر ہے۔ اسے لوگ
یں کورس بھی کہتے تھے۔ اس مندر میں پوجا کرنے والے لوگ ہارتے زیادہ ہیں جیتتے
ت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدررو ہے جو انسانی جسموں
غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر
انسان کے دل کی غلاظت دھلتی ہے اور بدررو میں انسان کے جسم کی غلاظت
ران دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پل ہے۔ مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف
ہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک
ڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ یہاں
روزان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے
پار جاتے ہوئے لوگ، مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ گاڑی
کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ اکثر ان ساڑھیوں کو

ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا گہرا بھورا رٹ میلا نیلا، قرمزی بھورا، گندا سرخ کنارا گہرا نیلا اور لال۔ وہ لوگ اکثر انھیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذبِ نظر نہیں رہے۔ کسی زمانہ میں ممکن ہے جب یہ نئی نئی خریدی گئی ہوں ان کے رنگ خوب صورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ مگر اب نہیں ہیں متواتر دھوئے جانے سے ان کے رنگوں کی آب و تاب مر چکی ہے اور اب یہ ساڑھیاں اپنے پھیکے سیٹھے روزمرہ کے انداز کو لئے بڑی بے دلی سے جنگلے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انھیں سو بار دیکھئے یہ آپ کو کبھی خوب صورت دکھائی نہ دیں گی۔ نہ ان کا رنگ و روپ اچھا ہے۔ نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا بھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں اُدھڑے ہوئے ٹانکے ہیں کہیں بدنما چتے داغ جو اس قدر پائدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں ڈھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ میں ان ساڑھیوں کی زندگیوں کو جانتا ہوں۔ کیونکہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی کے پل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے۔ بڑی غریب سی چال ہے میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں۔ اس لئے آپ کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اکتا جائیں گے۔ اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی

یتی ہوگی۔ مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں، میں اس کا گہرا بھورا رنگ
یکھ سکتا ہوں۔ کیوں کہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب اس کا رنگ چمکتا
دا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے۔ جیسا
انتا بائی کی ساڑھی کا اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے فرق
سوس کر سکیں۔ میں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں، تو
ہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے وہ شانتا بائی
ی ساڑھی ہے اور جو دوسری بھورے رنگ کی ساڑھی ہے اور جس کا گہرا بھورا رنگ صرف
یری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی
رتن مانجھنے کا کام کرتی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں ایک بڑی لڑکی ہے۔ دو چھوٹے لڑکے
ب۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی۔ سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی
ا خاوند سیون مل کے کپڑے کھاتے میں کام کرتا ہے۔ اسے بہت جلد جانا ہوتا ہے۔
س لئے شانتا بائی اپنے خاوند کے لئے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا
تی ہے۔ کیوں کہ صبح اُسے خود برتن صاف کرنے کے لئے اور پانی ڈھونے کے لئے
وسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے۔ اور اب وہ ساتھ میں اپنی چھ برس کی بچی کو بھی لے
اتی ہے۔ اور دوپہر کے قریب چال میں واپس آتی ہے۔ واپس آکے وہ نہاتی ہے۔
ر اپنی ساڑھی دھوتی ہے اور سکھلانے کے لئے پل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے۔ اور
ھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے لگ جاتی ہے۔ شانتا بائی
ے گھر چولھا اسی وقت سُلگ سکتا ہے۔ جب دوسروں کے ہاں چولھے ٹھنڈے ہو جائیں
ی دوپہر کو دو بجے اور رات کے نو بجے۔ ان اوقات کے اِدھر اور اُدھر اسے دونوں
ت گھر سے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی

بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے۔ چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اس کے گال سُرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں۔ اس دن شانتا بھی میرے نمستے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی بھُنتی بڑبڑاتی ہوئی چولہا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اور چولہے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے۔ تو شانتا بائی اس کے چینی ایسے نازک رخساروں پر زور زور سے چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی۔ اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیوں کہ اسے دودھ نہیں ملتا۔ اور اسے اکثر بھوک لگی رہتی ہے اور دو سال کی عمر ہی میں اسے باجرے کی روٹی کھانا پڑتی ہے۔ اسے اپنی ماں کا دودھ اپنے دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے۔ پھر یہ بھی خشک باجری اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں۔ اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجرا اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرنے جاتے ہیں۔ اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے۔ اور معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اور جب پگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانے کا رُخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لئے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ تو تاڑی پی نہیں سکتا۔ ایک دن... پئے گا دو دن پئے گا۔ تیسرے دن کی تاڑی کے لئے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے۔ راشن کا خرچہ ہے۔

جمعدار کی ہے۔ تیل اور نمک ہے۔ بجلی اور پانی ہے۔ شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے۔ جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔ کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مِل والے بھی پانچ روپئے چار آنے میں کیسی کھدری نکمی ساڑھی دیتے ہیں۔ اس کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی۔ چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے، جوڑ کے، گانٹھ کے، ٹانکے لگا کے کام دیتا ہے۔ اور پھر وہی پانچ روپئے چار آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آجاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ اس لئے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اسے گھروں میں جھاڑو دینا ہوتی ہے۔ برتن صاف کرنے ہوتے ہیں۔ تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے۔ وہ بھورا رنگ نہیں پسند کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی ـــــ وہ اتنی بیوقوف نہیں ہے۔ دو تین بچوں کی ماں ہے۔ لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے۔ پہنے تھے۔ انھیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا۔ جب وہ دھارواڑ میں اپنے گاؤں میں تھی جہاں اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی۔ جہاں میلوں میں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے جہاں کہ باپ کے دھان کے کھیت تھے۔ ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت اور آنگن میں پیرو کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی۔ جانے اب وہ پیروؤں میں مزا ہی نہیں ہے۔ وہ شیرینی اور گھلاوٹ ہی نہیں ہے۔ وہ رنگ، وہ چمک دمک کہاں جاکے مر گئی۔ وہ سارے رنگ کیوں یک لخت بھورے ہو گئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجتے مانجتے، کھانا پکاتے، اپنی ساڑھی دھوتے اسے پل کے جنگلے پر لاکر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹڑی پر بہتے جاتے ہیں اور دوسرے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پُل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری

ساڑھی کو پھیلاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑھی جو شانتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں گے تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ بھی ساڑھے پانچ روپے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں۔ اور اتنی دور سے معلوم بھی ہوتے ہیں۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی، لگایا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس پہلی ساڑھی کا ہے اور اس دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھونگ سوچا کرتی ہے۔ پرانی یادوں سے نئی یادوں کی تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے اس خاوند کے لئے روتی رہتی ہے۔ جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی ایک آنکھ کانی کر ڈالی تھی۔ وہ اس لئے نشے میں تھا کہ وہ اس روز مل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈا اب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربہ کار تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ وہ تو اب بعد دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پھیپھڑوں میں جا کے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور انیٹوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین تاگے پھنس جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اسے دمے میں مبتلا کر دیتے۔ اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر کھانستا۔ ایک خشک

اور مسلسل کھنکھار گھر میں اور کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا۔ سنائی دیتی رہتی۔ مل کے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سُنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ بعد مرگیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیا ہوا اگر غصّے میں آکے ایک دن اس نے جیونا بائی کی آنکھ نکال لی۔ تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصّے پر قربان نہیں کی جاسکتی اور اس کا غصّہ بجا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی۔ ڈھونڈو پیاسا تھا۔ اسے اپنی بے کاری کا غم تھا۔ اپنی ۳۵ سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا غم تھا اور سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ مل مالک نے چلتے وقت اسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا۔ ۳۵ سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے کے لئے آیا تھا۔ اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا۔ اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آکے اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان ۳۵ سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، سارا خون، اس کا سارا رس چوس لیا ہو۔ اور اسے بیکار سمجھ کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو۔ اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا۔ جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکایک ڈھونڈو نے غم اور غصّے سے اپنے ہاتھ ملے۔ زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانے میں چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی دہ جاتی۔ اگر اس کے پاس علاج کے لئے پیسے ہوتے۔ وہ آنکھ تو گل گل کر، سڑ سڑ کر، خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں، کمپونڈروں اور نرسوں کی بداحتیاطی اور کاہلیوں اور لاپرواہیوں کا شکار ہوگئی۔ اور جب جیونا اچھی ہوگئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکا۔ ان دنوں میں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند

گھروں میں برتن مانجھنے کا کام دلوا دیا تھا۔ اور گو وہ اب بوڑھی تھی۔ اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی اور کام کرتی رہی۔ کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔ لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی۔ خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی۔ اور اب اسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ گئی اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا بھڑکیلا لباس پہنے بیٹھی ہے۔ لیکن جیونا بائی کو یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کردی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ وہ ایسا نہ کرے گی، اس کا اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی۔ اور یہ سب کچھ چھوڑ کے وہ فارس روڈ کیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا۔ کیونکہ عورت محبت کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کے لئے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر یہیں چلی آئی تھی۔ جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش کو جلانے کے لئے لے جانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی۔ جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظر بچا

ے چھپا کر رکھی تھی۔ عین اُسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا
اس پہنے اس سے آ کے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اسے دیکھ کر
نا کو یقین آ گیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے اس کا پتی، اس کی بیٹی، اس کی عزت،
ے وہ زندگی بھر روٹی نہیں، غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا،
وع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔
ے نہتا، ننگا اور بے عزت کر دیا گیا تھا اور جیونا کو اس ایک لمحے میں احساس ہوا کہ
جگہ جہاں اس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جہاں اس کی آنکھ اندھی
ی اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی اپنی دکان سجا کر بیٹھ گئی، ایک بہت بڑا اندھا
خانہ ہے جس میں کوئی ظالم جابر ہاتھ انسانی جسموں کے لئے گنے کا رس نکالنے والی
ین میں ٹھونستا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا
تا ہے۔ اور یکایک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کر الگ کھڑی ہو گئی اور چیخیں مار مار
رونے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے۔
ٹیلا بھی ہے کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا اور
ا ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔ میں فورٹ میں دھتو بھائی کی فرم میں
ی کرتا ہوں۔ پینسٹھ روپئے تنخواہ ملتی ہے۔ سیتون مل اور بکسریا مل کے مزدوروں
بھی یہی تنخواہ ملتی ہے۔ اس لئے میں بھی انھیں کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک
میں رہتا ہوں۔ مگر میں مزدور نہیں ہوں، کلرک ہوں۔ میں فورٹ میں نوکر ہوں۔
دسویں پاس ہوں۔ ٹائپ کر سکتا ہوں۔ میں انگریزی میں لکھ سکتا ہوں۔ میں
وزیر اعظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔ آج تھوڑی دیر بعد ان کی
ی مہا لکشمی پر آئے گی۔ نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے

ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے۔ ان لاکھوں م
میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو اپنے وزیر اعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق
مگر میں اسے اپنے ساتھ لے نہیں جا سکتا کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وق
پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے۔ راشن تو روز کم پڑ
ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے۔ رات کو سونے کے لئے جگہ بھی کم پڑتی ہے اور تنخوا
تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینے میں صرف پندرہ دن چلتی ہے۔ باقی پندرہ دن سود خ
پٹھان چلاتا ہے۔ اور وہ بھی کیسے گالیاں بکتے جھکتے، گھسٹ گھسٹ کر کسی سست ر
مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس ان کی فیس
پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا تو ساوتری کو اپنے گھر لینی کھو
میں لایا تھا۔ تو میں نے سوچا تھا ان دنوں ساوتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کر
تھی۔ گوبھی کے نازک نازک پتّوں کی طرح پیاری پیاری باتیں۔ جب وہ مسکراتی تو سینما
تصویر کی طرح خوب صورت دکھا کرتی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے اس ک
جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے وہ ذرا سی بات پر بچّوں کو بے تحاشہ پیٹنا شروع
کر دیتی ہے۔ اور میں تو کچھ بھی کہوں کیسے بھی کہوں کتنی ہی لجاجت سے کہوں وہ آ
مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دف
میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں۔ گھر پر بیوی کی گالیاں سنتا ہوں۔ اور ہمیشہ خاموش ر
ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے
شاید اسے صرف ایک نئی ساڑھی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے
ماحول ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے، مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا ہوتا۔
اب تو آزادی آگئی ہے اور ہمارے وزیر اعظم نے بھی کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو تعی

ِگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیر اعظم
تقریر جو اخبار میں پڑھی تھی سنائی تو وہ اسے سُن کر آگ بگولہ ہو گئی اور اس نے
یں آکر چولھے کے قریب پڑا ہوا چمٹا میرے سر پر دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو
میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں اسی کا نشان ہے۔ مگر آپ انھیں نہیں دیکھ سکیں گے۔
دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک نشان تو اس مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی
ہے جو اس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک بھنجی مل بھوندو رام پارچہ فروش کی دکان پر
ی تھی۔ ایک نشان اس کھلونے کا ہے جو پچیس روپے کا تھا۔ اور جسے دیکھ کر
۔ پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا۔ لیکن جسے ہم خرید نہ سکے۔ اور جسے
کر میرا بچہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے
تھا جس میں ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا
تی تھی۔ لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی مجھے کسی سے روپے اُدھار نہ مل سکے۔ اور
وتری جبل پور نہ جا سکی۔ ایک نشان اس تار کا ہے جس میں اس کی ماں کی موت کا
تھا۔ ایک نشان ...... مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں۔ ان سے چھوٹے چھوٹے
ے گدلے غلیظ داغوں سے ساوتری کی پانچ روپے چار آنے والی ساڑھی میں
نل ہوتے جائیں گے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک
ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑھیاں ہیں لیکن بھورا رنگ ان سب میں
ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے۔ جیسے ان سب کی
ایک ہے۔ جیسے یہ سب زمین سے کبھی اوپر نہیں اٹھیں گی۔ جیسے انھوں نے کبھی
ہوئی دھنک، افق پر چمکتی ہوئی شفق، بادلوں میں لہراتی ہوئی بسنت نے دیکھی
۔ جیسے شانتا بائی کی جوانی ہے وہ جیونا کا بڑھاپا ہے۔ وہ ساوتری کا ادھیڑ پن ہے۔

جیسے یہ سب ساڑھیاں زندگیاں، ایک رنگ ایک سطح، ایک تواتر ایک سلسل لئے
لئے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جھبّو بھیئے کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی۔ کیوں کہ ایک تو اس کے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے۔ اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہیں ہو بڑی نحس ہوتی ہے۔ وہ جادو ٹونے کرکے دوسرے کے بچوں کو مار ڈالتی ہے۔ اور بد روحوں کو بلا کے اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے کبھی منھ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبّو بھیّا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبّو بھیّا مراد آباد کا رہنے والا ہے۔ لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کر ادھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے بہت جلد پورا کے گنّی کھاتے میں جگہ مل گئی۔ جھبّو بھیّا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا اسے بیڑی کا، تاڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو صرف اس بات کا اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستّر اسّی روپئے اکٹھا ہو گئے اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی۔ تاکہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے۔ پھر اس نے سوچا ان ستّر اسّی روپیوں میں کیا ہوگا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اس نے یہ رقم جوڑی تھی۔ لیکن اس رقم سے وہ مراد آباد جا سکتا تھا۔ جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے جھبّو بھیّا نے یہیں ایک بدمعاش سے بات چیت کرکے اس عورت کو سو روپئے میں خرید لیا۔ اسّی روپئے اس نے نقد دئیے۔ بیس روپئے اُدھار میں رہے جو اس نے ایک سال کے عرصے میں ادا کئے۔ بعد میں جھبّو کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی۔ دہ گاؤں کی اور اس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبّو بڑا خوش ہوا۔ چلو یہیں بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی ذات برادری کی، اپنے ضلع کی، اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے۔

سو روپئے میں مل گئی۔ اس نے بڑے چل چلاؤ سے اپنا بیاہ رچایا۔ اور پھر اُسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لڑیا بہت اچھا گاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں زور سے گانے بلکہ گانے سے زیادہ چلاّنے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں لڑیا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبّو اور لڑیا دونوں گاتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے ایک توتا پال رکھا تھا۔ لڑیا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبّو نہ بیڑی پیے۔ نہ سگریٹ نہ تاڑی۔ لڑیا بیڑی سگریٹ تاڑی سبھی کچھ پیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ سب کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر جب سے بدمعاش کے پلّے پڑی اسے یہ سب باتیں سیکھنا پڑیں۔ اور اب وہ اور سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی پی کر لڑیا نے جھبّو پر حملہ کیا۔ اور جھبّو نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر توتا بہت شور مچاتا تھا۔ اور رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر خود بھی پنجرے میں ٹنگا ہوا زور زور سے چلاّ کر وہی گالیاں بکتا جو وہ دونوں بکتے تھے۔ ایک بار تو اس کی گالی سن کے جھبّو غصّے میں آ کر طوطے کو پنجرے سمیت بدرو میں پھینکنے لگا تھا۔ مگر جیونا نے بیچ میں پڑ کر توتے کو بچا لیا۔ توتے کو مارنا بڑا پاپ ہے۔ جیونا نے کہا۔ تمھیں برہمنوں کو بلا کے پرائشچت کرنا پڑے گا اور تمھیں پندرہ بیس روپئے کھل جائیں گے۔ یہ سوچ کر جھبّو نے توتے کو بدرو میں غرق کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو وہ جھبّو کو ایسی شادی ——— پہ چاروں طرف سے گالیاں پڑیں۔ وہ خود بھی لڑیا کو بڑے شبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور کئی بار اُسے بلا وجہ پیٹا۔ اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اُس کی نگرانی کرتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ لڑیا کہتی کہ کوئی عورت سچّے دل سے بدمعاشوں کے پلّے پڑنا پسند نہیں کرتی۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے چاہے وہ چھوٹا

ہی سا گھر ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اس کا اپنا ہو۔ چاہے وہ جھبتو بھیا ایسا شور مچانے والا۔ زبان دراز، شیخی خورا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو۔ اور اب لڑیا کے پاس گھر بھی تھا اور جھبتو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا ہو جائے گا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لڑیا اپنے میاں مٹھو کا پنجرہ جھلا رہی تھی۔ اور اسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اس ننھے سے بالک کو دیکھ رہی تھی جو فضا میں ہمکتا ہمکتا اس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا۔ اور اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبتو کو اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ اور ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھاگتی بھاگتی نیچے گئی۔ اور اس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کر اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ اور اپنی کھولی میں لے آئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبتو سے گنی کھاتے کے منیجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس پر جھبتو نے بھی اسے دو ہاتھ جڑ دیئے۔ اس پر بہت واویلا مچا۔ اور منیجر نے اپنے بدمعاشوں کو بلا کر جھبتو کی خوب ٹھکائی کی۔ اور اسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبتو بچ گیا۔ ورنہ اس کے مرنے میں کوئی کسر نہیں تھی۔ لڑیا نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اس نے اسی روز سے اپنے سر پر ٹوکری اٹھالی۔ اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی۔ جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی تھی۔ اس طرح محنت مزدوری کرکے اس نے اپنے جھبتو کو اچھا کر لیا۔ جھبتو بھلا چنگا ہے مگر اب اسے کسی مل میں کام نہیں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں پڑا مہالکشمی کے اسٹیشن کے چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے سیون مل، نیو مل، اولڈ مل، پورا مل، موہج مل۔ لیکن اس کے لئے کسی مل

کی جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ مزدور کو گالی کھانے کا حق ہے۔ گالی دینے کا حق نہیں ہے۔
آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دے کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے۔ اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اس نے بیڑی، تاڑی سب چھوڑ دی ہے۔ ہاں اس کی ساڑھی، قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر جھبو کو کام نہ ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑھی میں پرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے۔ اور اپنے میاں مٹھو کو چوری کھلانا بند کرنا پڑے گا۔

پانچویں ساڑھی کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔ ساڑھی کا رنگ گدلا سرخ ہے، لیکن کنارا گہرا نیلا ہے۔ اور اس نیلے میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑھی دوسری ساڑھیوں سے بڑھیا ہے۔ کیونکہ یہ ساڑھی پانچ روپئے چار آنے کی نہیں ہے۔ اس کا کپڑا، اس کی چمک دمک کہے دیتی ہے کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ آپ کو دور سے یہ مختلف معلوم نہیں ہوتی ہوگی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ اس کا کپڑا بہتر ہے۔ اس کا کنارا چمک دار ہے۔ اس کی قیمت پونے نو روپئے ہے۔
یہ ساڑھی منجولا کی ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے۔ منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اس کا خاوند گذشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے پٹے کی لپیٹ میں آ کے مارا گیا تھا۔ اور اب سولہ برس کی خوب صورت منجولا بیوہ ہے۔ اس کا دل جوان ہے۔ اس کا جسم جوان ہے۔ اس کی امنگیں جوان ہیں لیکن اب وہ کچھ نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مرگیا ہے۔ وہ پٹہ بڑا ڈھیلا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار بیٹھتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا۔ کیوں کہ کام چل رہا تھا اور دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لئے کام بند کرنا پڑتا۔ پٹے کو تبدیل کرنے کے۔ ... بھی خرچ ہوتا۔ مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے روپیہ تھوڑی

خرچ ہوتا ہے لیکن پڑتا تو بڑی قیمتی شے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی جو نامنظور ہوئی۔ کیوں کہ منجولا اپنی غفلت سے مرا تھا اس وجہ سے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا۔ اور وہ اپنی وہی نئی دُلہن کی ساڑھی پہنے رہی۔ جو اس کے خاوند نے پونے نو روپیے میں اس کے لئے خریدی تھی۔ کیوں کہ اُس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہیں تھی۔ جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے مرجانے کے بعد بھی دولہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی۔ کیوں کہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی۔ اور جو ساڑھی تھی وہ بھی گہرے سرخ رنگ کی۔ پونے نو روپئے کی ساڑھی جس کا رنگ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپئے چار آنے کی ساڑھی پہنے گی۔ اس کا خاوند زندہ رہتا جب بھی وہ دوسری ساڑھی پانچ روپئے چار آنے کی لاتی۔ اس لحاظ سے اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ مگر فرق اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے۔ ایک سفید ساڑھی پانچ روپئے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دُلہن نہیں۔ بیوہ معلوم ہو سکے۔ یہ ساڑھی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے اس ساڑھی سے جیسے اس کے مرحوم خاوند کی مضبوط باہیں لپٹی ہیں جیسے اس کے ہر تار پر اُس کے شگفتہ بوسے مرتسم ہیں، جیسے اس کے تانے بانے میں اس کے خاوند کی گرم گرم سانسوں کی حدت آمیز گلفتگی ہے۔ اس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے یہ ساڑھی نہیں ہے۔ ایک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائی کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹ لینے پر مجبور ہے۔ منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے۔ لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ اس کی پہننے والی مر چکی ہے۔ پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے۔ روز کی طرح

دُھلی دُھلائی ہوا میں جھول رہی ہے ۔ یہ مائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا تھا سیتو، وہ اب جیل میں ہے۔ سیتو کی بیوی اور اس کا لڑکا یہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب دیوار کے نیچے پڑے رہتے ہیں۔ سیتو اور سیتو کی بیوی اور اس کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب لوگ ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لئے کھولی بھی نہیں ہے۔ اور ان کے لئے اتنا کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا جتنا ہم لوگوں کو ملتا ہے اس لئے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں، وہیں کھانا پکاتے ہیں، وہیں پڑ کے سو رہتے ہیں۔ یہیں یہ بڑھیا مائی ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑھی میں دیکھ رہے ہیں۔ پلو کے قریب یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کے ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی۔ رنہیں، وہ اس ہڑتال میں حصہ نہیں لے رہی تھی، وہ بے چاری تو بہت بوڑھی تھی۔ چل پھر نہ سکتی تھی۔ اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا سیتو اور دوسرے بھنگی شامل تھے۔ یہ لوگ مہنگائی مانگتے تھے۔ اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے۔ یعنی اپنی زندگی کے لئے دو وقت کا روٹی کپڑا اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے اس لئے ان لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دے دی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا۔ اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا سیتو آگے آگے تھا اور خوب زور و شور سے نعرے لگاتا تھا اور پھر جب جلوس بھی خلاف قانون قرار دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی ہم لوگوں نے تو اپنے دروازے بند کر لئے لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا۔ اور پھر ہم کو اپنے بند کمروں میں ایسا معلوم ہوا گویا گولی ادھر سے اُدھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا۔ اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا۔ اور ہماری چال کے دروازے کے قریب بڑھیا پڑی تھی۔ یہ اسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے جس کا بیٹا سیتو اب جیل

میں ہے۔ اس لال ساڑھی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہیے تھا مگر کیا کیا جائے تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے۔ مُردوں کی عزت اور احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑھی جلنے جلانے کے لئے نہیں ہے، تن ڈھکنے کے لئے ہے۔ ہاں کبھی کبھی سیتو کی بیوی اس کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے کیوں کہ اس میں پچھلے اسی برسوں کے سارے آنسو اور ساری اُمنگیں اور ساری فتحیں اور شکستیں جذب ہیں۔ آنسو پونچھ کر سیتو کی بیوی پھر اسی ہمت سے کام کرنے لگتی ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کہیں گولی نہیں چلی، کوئی جیل نہیں گیا۔ بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چلنے لگی۔

اے لو، باتوں باتوں میں وزیرِ اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیرِ اعظم صاحب درشن دینے کے لئے گاڑی سے نکل کے تھوڑی دیر کے لئے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے۔ اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہالکشمی کے پُل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔ یہ چھے ساڑھیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں۔ ایسی معمولی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں جہاں ایک کونے میں چولہا سلگتا ہے۔ ایک ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ اور ہر طاقچے میں شیشہ ہے۔ کنگھی ہے اور سیندور کی ڈبیہ ہے۔ کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں جنھیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں۔ ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں۔ ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیرِ اعظم صاحب یہ ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا ملک

کوئی بڑا عہدہ، کوئی بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکا، کوئی پرا پرٹی، یا ایسی کسی چیز کی تم سے طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ دیکھئے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے جس کے گیت مر چکے ہیں۔ اور جس کے پاس اپنے بچوں کے اسکول کے لئے فیس نہیں ہے۔ یہ لڑیا ہے جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک توتا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑھی ہے جس کے خاوند کی زندگی پہ چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمت ہے۔ یہ بڑی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کی پھال میں تبدیل کرنا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اُٹھے۔ اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کر لہرانے لگیں۔

لیکن وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نہیں رُکی اور وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرنے کے لئے چوپاٹی چلے گئے۔ اس لئے اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی ادھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھئے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمیں ساڑھیوں کو بھی دیکھئے جنھیں دھوبیوں نے اسی پُل کے دائیں طرف سوکھنے کے لئے لٹکا رکھا ہے۔ اور جو اُن گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہوں کے پانے والے رہتے ہیں۔ آپ اس پُل کے دائیں بائیں دونوں طرف دیکھئے اور پھر اپنے آپ سے پوچھئے کہ آپ کس کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھئے! میں آپ سے اشتراکی بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں، میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی کے پُل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف۔

غلام عباس

آنندی

بلدیہ کا یہ اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیوں کہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔

.... اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اور بازار کے تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں

ان آبرو باختہ اور نیم عُریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دل ربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُرمسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنّم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

.... اور صاحبان! پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ نونہالانِ قوم جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا پھر ان ہی کے سر بندھے گا۔ انھیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہوکر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں ہر وقت بارہ ابھرن، سولہ سنگھار کئے ہر راہ پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سنان برساتی ور اسے دعوتِ حُسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انھیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے، ناتجربہ کار، وانی کے نشہ میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات ور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! یا ان کا حُسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر ان کے دل میں ناہ کی پُراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کرکے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا کر دیتا ہوگا.........؟"

اسی موقع پر ایک رُکنِ بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرّس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار ے شغف رکھتے تھے بول اُٹھے:۔

" صاحبان! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبا کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔

ایک رُکن نے جو چشمہ لگائے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی

تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا۔" حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جارہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جارہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل وغارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جارہی ہے۔ اس کا سبب محض ان زنان بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیوں کہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوکر ہوش وخرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کے بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی وکوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے ہیں اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جان عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دُنیا کا سرد وگرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل وعیال کو اپنے سائے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اُٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی اور لہجہ فریاد کا انداز لیے ہوئے تھا۔ بولے "صاحبان! رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور وغل، ہاہاہا، ہوہو ہو سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے۔۔

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیوں کہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان

ں بازارِ حُسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رُکنِ بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علم بردار تھے اور آثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا:

" حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ جب وہ اس بازار سے گزرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدرِ بلدیہ تقریر کرنے اُٹھے۔ گو قد ٹھنگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں صد درجہ متانت تھی۔ بولے " حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لئے باعثِ صد ... ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے " یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یک بارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے۔

"حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس لئے ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انھیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے، اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے " بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں،

مگر اس شہر کو خالی کر دیں"۔

صدر نے کہا: "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سیکڑوں پر پہنچتی ہے۔ اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات بھی ہیں۔

یہ مسئلہ کوئی مہینہ بھر تک بلدیہ کے زیرِ بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاقِ رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیئے اور ان کو رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہیئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں۔ مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے مکانوں ہی میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصہ میں وہ نئے علاقہ میں مکان بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی۔ اور اس کے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں کوئی بستی ہو گی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دھاڑے اُلّو بولتے تھے۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی

تے۔ یا یوں ہی پھرتے پھراتے اِدھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر
نان میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ
علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق
وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں۔
پنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ
علاقے میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو
شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے
ت محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ دیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس شہر میں ان کے جو ملوکہ مکان
ان کے دام انھیں اچھے مل گئے تھے اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔
سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے
تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی
ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔
کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے
اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں،
دں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب
کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر
معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے، مزدور ادھر
دوڑتے پھرتے۔ مزدورنوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے

بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤ
کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے
دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے۔ اور اس کے پاس ہی
کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر
کی غرض سے کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے
سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لئے کسی نے
اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہوگئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج مز
میرِ عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامو
اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی، اس بست
خبر سن کر آگئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب
درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ، بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا
بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک
اٹھا لایا اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا، پیسے کے دو د
کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی تو وہ ایک ٹوکرے میں خربوز
بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر "لے لو خربوزے، شہد سے میٹھے خربو
کی صدا لگانے لگا۔ اس شخص نے کیا کیا گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوا
لگا، تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کر آموجو
اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنوئیں سے پانی
نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا
تا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ایک ملا کے
ن میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن
المصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنج سورہ، رحل اور مسئلے مسائل
چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ کر آموجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر
ے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے
جاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا، کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں
پڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو
اتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھوس کا ایک چھپر ڈال
رگرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے
ں کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر ادھر گشت کرتا دکھائی دیتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی
ے۔ کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی
بنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آجاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔
ں موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں اور
ب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات
رنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش بے کار مباش کچھ کیا کر کے مصداق شہر سے
ل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آجاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی
ئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گرد اگرد چکر لگاتے رہتے۔

فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ روز کیابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہُو کا عالم تھا، اب ہر طرف گ
اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی سے ان جیسوا
یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ
خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں
کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا م
تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں
دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا، تڑنگا م
لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا اور کنکر پتھ
پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا اور پانی
مزار پر لے جانے لگا اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر دو تی
مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا: "
یہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا۔ میرے باپ دادا ان کے مجاور ر
اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے پیر کڑک
کی کچھ جلالی کرامات بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں
لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیے۔ رات
پہر کبھی کبھی اس مزار سے "اللہ ہُو" کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب م

اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف بیچ میں چوڑی سڑک تھی اور ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دو کانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رُخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھیں جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگِ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا اس میں سنگِ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمک دار اور پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگِ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کر کے شامیانے نصب کر دئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو میلوں میل کوس سے فقیروں اور کتّوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جانا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ گاؤ تکیے لگا دیے گئے۔ پان دان، پیک دان، پیچوان اور گلاب پاش رکھ دئے گئے۔ اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی

سہیلیاں یا برادری کی تھیں ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آتے. جن کے لئے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رُخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے ادھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساڑیوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں سے بسی ہوئی نازنینیں اٹکھیلیوں سے چلتیں، رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف، بلوری، قدِ آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات، سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، فلش جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا۔ یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتا جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں

وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ ان کی قوس قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھل مل جھل مل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے ٹوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لئے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز، قلقل مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دوکانوں کے کرایہ دار پیدا ہونے شروع ہو گئے، جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دوکان دار آیا وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور انھیں منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگرٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لیئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دوکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگرٹ تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کے نصف درجن

ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں کنجڑے آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں، چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دوکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انھیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا۔ اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے۔ سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آگیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اسی کی دوکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر،

قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹی، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کو سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکان دار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھے ہوئے کرایوں سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرائے پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے چٹنی اچار کے مرتبانوں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جا کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انھوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دو کانیں بچ رہیں ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک پیشوا کے سازندے نے ایک دوکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دوکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دل ربا وغیرہ ٹانگ دیے گئے۔ یہ شخص ساز بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دوکان دار آجاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دوکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملا جی جب تک یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جب کہ انھیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے۔ جس سے ملا جی کو دو پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک ستھر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اسی بستی کا رخ کیا اور بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلے پر میدان میں تنبو کھڑے کرکے ڈیرے ڈال دیے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے۔ جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ۔ کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت و مشقت کی کسر شور و غل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے

نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے راہ چلتوں پر آوازیں کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تمبورے : ہر ایک اسٹول پر اکڑا کبھی کولھا ہلاتا، کبھی منہ پُھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا۔ عجیب عجیب حیاسوز حرکتیں کرتا جنھیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے۔ "آؤ کوئی نئی بستی کو" شہر سے پانچ کوس تک جو پکّی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کی لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا بُرا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم داموں پر سواریاں بٹھا طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پُراسرار بازار کی سیر کرنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انھیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے کو تیار نہ ہوتی تھیں، ایام کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے

تو جھٹ زمین خرید کر ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اس وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکان دار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لئے درخواست بھیجی گئی تھی۔ جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ، بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہئے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔

اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام

باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یوں ہی سستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کے بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصا سیرگاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کے تیل کی مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے، دل پسند، دل بہار مالش کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دوکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لئے کمرے بھی مل سکتے تھے۔ اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا ایک فوٹو گرافر، ایک سائیکل مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آرہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کا باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے، سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے لے کر آپہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پُرا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن ہے اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لئے ایک لڑکیوں

کے ۱۲ اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔
چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بینکوں کی شاخیں ہیں۔
شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔
ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں دو مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے، چھ یتیم خانے پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔
شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے 'حسن آباد' کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے 'حسن آباد' کے 'حسن آباد' کہنے لگے۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حسن اور حسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سیکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی، اور وہ نام ہے "آنندی۔"
یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوش نما ہے۔ مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔
آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔
ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر اس طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دی گئی۔
اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

راجندر سنگھ بیدی

اپنے دکھ مجھے دے دو

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔ جب چکلی بھابی نے پھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں ڈھکیل دیا تو اندو سامنے شالوں میں لپٹی اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر چکلی بھابی اور دریا باد والی پھوپھی اور دوسری عورتوں کی ہنسی، رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی۔ عورتیں سب ہی سمجھتی تھیں کہ اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ جب اُسے بیچ رات سے جگایا گیا۔ تو وہ بڑبڑا رہا تھا: "کہاں کہاں لئے جا رہی ہو مجھے؟"

ان عورتوں کے اپنے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا۔ اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تلی ہوئی تھیں۔ زمین کی یہ بیٹیاں مرد کو تو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہے جس کی طرف بارش کے لئے منہ اٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ نہ برسے تو منتیں ماننی پڑتی ہیں۔ چڑھاوے چڑھانے

پڑتے ہیں! جادو ٹونے کرنے ہوتے ہیں حالانکہ مدن کالکاجی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ میں پڑا اسی وقت کا منتظر تھا۔ پھر شامت اعمال پڑوسی سبطے کی بھینس اُس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سونگھ لیتی تھی اور وہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔ ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا۔؟

سمندر کی لہروں اور عورت کے خون کو راستہ بتانے والا چاند ایک کھڑکی کے راستے سے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں کھتا ہے۔ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے۔ جیسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دُلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹک گیا۔ جبھی اس نے سوچا — اندو میری بیوی ہے۔ کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں شالو میں لپٹی ہوئی دُلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، وہاں اندو کا منہ ہوگا اور جب ہاتھ بڑھا کر اُس نے پاس پڑی گٹھری کو چھوا تو وہیں اندو کا منہ تھا....

مدن نے سوچا تھا۔ وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی۔ لیکن اندو نے ایسا نہ کیا۔ جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو۔ اور کسی خیالی بھینس کے سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑپھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لئے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سایہ دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی۔ جیسی دو سرسبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایکی اُٹھنے والے

یالے بال ۔

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو۔ لیکن دیر کے لئے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے ہی سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دُلہن کا چہرہ پھر سے اوپر کو اُٹھا دیا۔ اور شرابی سی آواز میں کہا۔ "اندو!"

اندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا، اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس اکیلی اور بے مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اور صرف اتنا سا کہا۔ "جی!" اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا۔ اور پھر ہولے ہولے بات چل نکلی اب جو چلی تو وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اندو کے بھائی، مدن کی بہن، باپ، ان کی ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت سبھی کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا۔ جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چل بسی تھی۔ "جتنی دیر زندہ رہی بیچاری"۔ مدن نے کہا۔ "بابو جی کے ہاتھ میں دوائی کی بوتل رہی۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بلوں پر سوتے رہے۔ اور آخر ایک دن ـــــ ۲۸ مارچ کی شام ـــــ اور مدن چپ ہو گیا۔ چند لمحوں میں وہ رونے سے ذرا اِدھر اور گگھی سے ذرا اُدھر پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اندو کو اپنے پن سے اِدھر اُدھر

بیگانے پن سے ادھر پہنچا دیا تھا......... مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جا
چاہتا تھا۔ لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا۔" میں تو پڑھی لکھی نہیں ہو
—— پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں، بیسیوں او
دیکھے ہیں۔ اس لئے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں......... میں اب تمھاری ہوں
اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔"
روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری ا
دریا دلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا—— "کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دو
"پکی بات؟" اندو بولی۔
مدن نے کچھ اتاولے ہو کر کہا۔" ہاں ہاں —— کہا جو پکی بات۔"
لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا —— میرا کاروبار پہلا
مندا ہے، اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو۔ تو پھر کیا ہو گا
اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے اور ا
اپنے گال رکھتے ہوئے کہا۔
"تم اپنے دُکھ مجھے دے دو۔"
مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اسے اپنے آپ پر سے ایک بوجھ بھی اُترتا ہوا
ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک بار پھر اندو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ
نہ جان پایا اس نے سوچا یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہو گا جو اندو نے کہہ دیا۔ جب
جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے
"دیئے —— !" لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی بہیمیت چھین لی تھی۔
مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ چکلی بھابی دو بچوں کو انگلیوں
لگائے سیڑھیوں کی اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریا باد والی پھ

"نو لکھے" ہار کے گم ہو جانے پر شور مچاتی ہوا دھر ملا کرتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی۔
جو غسل خانے میں پڑا ہوا مل گیا تھا۔ جہیز میں سے اپنے حصے کے تین کپڑے کر چلی گئی۔
چا چا گئے۔ جن کو ان کے جے۔ پی ہو جانے کی خبر تار کے ذریعے سے مل گئی تھی اور جو شاید
اسی میں مدن کے بجائے دلہن کا منہ چومنے چلے تھے۔
گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ چھوٹی دلاری تو ہر وقت
ی کی ہی بغل میں گھسی رہتی۔ گلی محلے کی کوئی عورت دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے۔ دیکھے تو
دیر تک دیکھے۔ یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندو آہستہ آہستہ پرانی
گئی۔ لیکن کالکا جی کی اس نئی آبادی کے لوگ اب بھی آتے جاتے۔ مدن تو اس کے سامنے
جاتے۔ اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ اندو انھیں دیکھتے ہی ایک دم گھونٹ کھینچ
لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونٹ کے دکھائی ہی
ے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں
چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آلیا تھا۔ اور وہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے
سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بیروزہ مہنگا پڑتا
در لوگ اسے مہنگے داموں پر خریدنے کو تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی۔ اس پر
جلدی ہی دوکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا۔ گھر پہنچ کر اس کی
ا کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔ جب ہی وہ
تے وقت خود تھالیاں اٹھا اٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا۔ اور ان کے کھا چکنے
مد جھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے بہو۔ بھابی نے مدن کے
میں کچھ پھونکا ہے اور اب وہ گھر کے کام کاج میں دل چسپی لینے لگا ہے۔ مدن سب سے
تھا۔ کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب کندن بھابی کے سواگت میں سب کے

ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا۔
"کھاؤ تم۔" وہ کہتا۔ "وہ بھی کھا لیں گے۔" اور پھر رسوئی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگ
اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو
دھنی رام اُسے روکتے ہوئے کہتے۔ "رہنے دے بہو۔ برتن صبح ہو جائیں گے۔"

اندو کہتی۔ "نہیں بابوجی ——— میں ابھی کئے دیتی ہوں جھپاکے سے۔"

تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہتے۔ "مدن کی ماں ہوتی
تو یہ سب تمھیں نہ کرنے دیتی......." اور اندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔"

چھوٹا پاشی بھابی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ دُلہن کی گود جھٹ سے
ہو۔ چکی بھابی اور دریا باد والی پھوپی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی
میں ڈالا تھا۔ جب سے اندو اُسے نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی جب بھی
پیار سے پاشی کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی۔ تو وہ گھبرا اُٹھتا اور
آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتا اور ہنستا رہتا۔ پاس آ
ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق سے۔ ایسے میں بابوجی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے۔ اور پا
ڈانٹتے ہوئے کہتے۔ "ارے جا نا ——— بھابی پیار کرتی ہے۔ ابھی سے مرد ہو گیا!
اور دُلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس کے "میں تو بھابی کے ساتھ ہی سوؤں
کے اصرار نے بابوجی کے اندر کوئی جناردھن جگا دیا تھا۔ ایک رات اسی بات پر دلا
زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچی، آدھی پکی نالی میں جا گری۔ اندو
ہوئے پکڑا تو سر پر سے دوپٹہ اڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا
کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ "بابوجی!" اندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہ
ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گ
اس بے ماں کی بچی کو چھاتی سے لگائے ہوئے اندو نے اسے ایک ایسے بستر میں لٹا

جہاں سرہانے ہی سرہانے، تکیے ہی تکیے تھے۔ نہ کہیں پائی تھی نہ کاٹھ کے بازو۔ چوٹ تو ایک طرف کہیں کوئی چبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی ہوئی اسے دکھا بھی رہی تھیں اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے پیارے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ہائے ری منی! تیری ساس مرے، کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں گالوں پر — !"

منی نے منی کی طرح کہا "گڑھے تمھارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی!"

"ہاں منو!" اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پر غصہ تھا۔ وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ بولا "میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے!"

"کیوں اچھا کیوں ہے؟" اندو نے پوچھا۔

"ہاں — نہ رہے بانس نہ بجے بانسری..... ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔"

اندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا "تم جاؤ جی سو رہو جا کر..... بڑے آئے ہو..... آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟ مرگھٹ کی چپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔ جاؤ نہ رسوئی میں تمھارا کیا کام؟"

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی سے اپنے اپنے بستروں میں یوں جا کر پڑے تھے جیسے دفتروں میں چھٹیاں سارٹ ہوتی ہیں لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اُسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا۔ لیکن اس وقت جب اندو نے بھی اُسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا۔ لیکن بابو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی تھی۔ جب منی کو سلانے کے لئے اندو کی لوری کی آواز سنائی دی — "تو آنند یا رانی، بورائی مستانی!"

وہی لوری جو دلاری منی کو سُلا رہی تھی، مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اُس نے زور سے چادر سر پر کھینچ لی۔ سفید چادر کے سر پر لپیٹنے اور سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مُردے کا تصوّر پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے۔ اور اس کی دُلہن اندو، اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑی توڑ رہی ہے۔ اور پھر گرتی پڑتی روتی چلاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولہے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے اور پھر باہر لپک جاتی ہے اور بانہیں اُٹھا اُٹھا کر گلی محلّے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے۔ "لوگو! میں لُٹ گئی۔" اب اسے دوپٹے کی پروا نہیں۔ قمیص کی پرواہ نہیں۔ مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول، اور چوڑیاں، جذبات اور خیالات کے طوطے تک اُڑ چکے ہیں۔

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہہ رہے تھے۔ حالانکہ رسوئی میں اندو ہنس رہی تھی۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کے اُجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دنیا میں آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا۔۔۔۔۔۔ ادھر اندو تو ہنس رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابو جی کے خیال سے وہ کبھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی۔ جیسے کھلکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی، دوپٹہ، اور دبی دبی ہنسی ایک گھونگھٹ ہے۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بُت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی ـــــ اندو ـــــ اور پھر چپ ہو گیا۔ اس ادھیڑ بن میں وہ بورائی مستانی نندیا بھی اس سے لپٹ گئی ـــــ ایک اونگھ سی آئی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات والی، پڑوسی سبطے کی بھینس منہ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اُٹھا، پھر رسوئی کی طرف دیکھتے، سر کو کھجاتے دو تین جمائیاں لے کر لیٹ گیا ـــــ سو گیا ـــــ

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر
کی سلوٹیں سیدھی کرنے کے لئے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم
جاگنے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے
اور ایکا ایکی اٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ سے پھنک رہا تھا۔
اور یہی اس کے غصے کا کارن بن گیا۔ جب اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"سو تم ——— آگئیں"

"ہاں"

"منی ——— سو مر گئی"

اندو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "ہائے رام" اس نے ناک پر انگلی رکھتے
ہوئے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو...... مرے کیوں بیچاری۔ ماں باپ کی ایک ہی بیٹی"

"ہاں ———" مدن نے کہا۔ "بھابی کی ایک ہی نند" اور پھر ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار
کرتے ہوئے بولا۔ "زیادہ منہ مت لگاؤ اس چڑیل کو"

"کیوں اس میں کیا پاپ ہے"

"یہی پاپ ہے" مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا۔ "وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تمہارا۔ جب
دیکھو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ دفان ہی نہیں ہوتی"

"ہا ———" اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بہنوں اور بیٹیوں کو یوں
دھتکارنا نہیں چاہئے۔ بیچاری دو دن کی مہمان۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔
ایک دن چل ہی دے گی" اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کی
آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ بھائی بہن چچا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری تھی۔
پلک جھپکتے ہی نیاری ہو گئی۔ اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں۔
جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بانبی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ پکڑ کر پھنکوائی

نہیں جاتی۔ گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دور دور سے کھیلنے والے تھن کرنے والے۔ دانت پھوڑنے والے ماندری بلوائے گئے۔ اور بڑے بڑے دھنتوری اور سوتی ساگر۔ آخر ایک دن اتر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی۔ جس میں گوٹے کناری میں لپٹی ہوئی ایک دُلہن بیٹھی تھی۔ پیچھے گھر میں ایک سُر پر بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی۔

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا —— "تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمھیں ہم سے زیادہ پیارے لگتے ہیں"

"ہاں"! اندو نے اثبات میں کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے....... یہ ہو ہی نہیں سکتا"

"تمھارا مطلب ہے میں ——"

"دکھاوا ہے یہ سب —— ہاں!"

"اچھا جی" اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا "یہ سب دکھاوا ہے میرا"؛ اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی۔ اور سرہانے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن اُسے منانے ہی والا تھا کہ اندو خود ہی اٹھ کر مدن کے پاس آگئی۔ اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی "تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو —— ہوا کیا ہے تمھیں"؛ شوہرانہ رعب داب کے لئے مدن کے ہاتھ بہانہ آگیا "جاؤ جاؤ —— سو جاؤ جا کے" مدن نے کہا "مجھے تم سے کچھ نہیں لینا"

"تمھیں کچھ نہیں لینا مجھے تو لینا ہے"۔ اندو بولی۔ زندگی بھر لینا ہے۔ اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا۔ اور وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتی تھی وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کے بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی اوپر ہی اوپر پہنچنا چاہتی ہو۔

چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی ——

"پھر مجھے پھاپھا کٹنی کہوگے۔؟"

"وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں!"

"ٹھہرو ——— تمہاری تو ———" یوں معلوم ہوا جیسے اندر کوئی گالی دینے والی ہو۔ اور اس نے مُنہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا؟" اور اندو نے اب کی سنائی دینے والی آواز میں دُہرایا۔ مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے اندو مدن کے بازوؤں میں تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔ "تم مرد لوگ کیا جانو؟ ——— جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی عزیز پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ کیا بھائی اور کیا بہن ———" اور ایکا ایکی کہیں دور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تو دلاری منی کا بیاہ کروں گی!"

"حد ہوگئی"۔ مدن نے کہا۔ "ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی سوچنے لگیں۔"

"تمھیں ایک ہاتھ کی دِکھتی ہے نا"؟ اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی۔ "ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو"۔ مدن نے سچ مچ ہی آنکھیں بند کر لیں اور جب کچھ دیر تک نہ کھولیں۔ تو اندو بولی۔ "اب کھولو بھی ...... اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔ جبھی مدن نے آنکھیں کھول دیں۔ لمحہ بھر کے لئے اسے یوں لگا جیسے سامنے اندو نہیں منی بیٹھی ہے اور وہ کھوسا گیا۔

"میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اس کے لئے اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "تم کیوں پریشان ہوتے ہو...... یاد نہیں اپنا وچن؟ .... تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو!"

"ایں؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا۔ اور جیسے بے فکر ہو گیا۔ لیکن اب کے جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہاں ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا۔ ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی ....

مدن کے لئے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ کسی کمی

وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا خواب کے تاروں سے بُنا ہوا آہوں کے دھوئیں سے رنگین۔ قہقہوں کی زرتاری سے چکاچوند جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرفِ عام میں بیوی کہلاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز، کپڑا ننگاپن ڈھانپنے کے لئے ملتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گرے پڑے تھے۔ لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھیں، عزت اور پاکیزگی کی ایک سفید اور بے داغ ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور ـــــ

مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوئے، جسے سکھانے کے لئے وہ انھیں اوپر ہوا میں اٹھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلاتا ہوا، ایک تشنجی کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھیلتی پھٹتی ہوئی پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا۔ اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا ـــــ اندو کا مرمریں جسم خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لئے پاس، ابتذال کے لیے دور...... کبھی جب اندو کی ناکہ بندی ہو جاتی تو اس قسم کے فقرے ہوتے ـــــ

"ہائے جی، گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں۔ وہ کیا کہیں گے۔"

مدن کہتا۔ "چھوٹے سمجھتے نہیں ـــ بڑے انجان بن جاتے ہیں۔"

اسی دوران میں بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارنپور ہو گئی۔ وہاں وہ ریلوے میل سروس میں سلکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے لیکن بابو دھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگیں پھیلائے کھڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علاحدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی آخر زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی۔ لیکن مجبوری تھی، بچے سب دلی میں مدن اور اندو کے پاس تھے۔ اور وہیں اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے انھیں بیچ میں اٹھانا ان کی پڑھائی کے لئے اچھا

نہ تھا۔ بابو جی کے دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں۔ ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی اور دُلاری کے ساتھ سہارنپور بھیج دیا ——— دھنی رام کی دُنیا چمک اٹھی۔ کہاں انھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی۔ اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے بچوں ہی کی طرح جہاں کپڑے اتارتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انھیں سمیٹتے پھرتے۔ اپنے مدن سے دور اُلسائی ہوئی رتی، اندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہو گئی تھی۔ وہ رسوئی میں یوں پھرتی تھی جیسے کانجی ہاؤس میں گائے، باہر کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہو۔ کام وام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی۔ کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ تلے۔ جو آنگن میں کھڑا سیکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے ہوئے تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں، نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں ——— جھولا کن نے ڈارو رے امریاں ——— اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولتیں اور دو جھلاتیں اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہو جاتیں۔ ادھیڑ عمر کی بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہو گئی ہے۔ جبھی وہ منہ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابو جی پاس سے گزرتے تو اُسے جگانے، اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقع پا کر اس شلوار کو جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انھیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں۔ لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مڑتے ہی تو نیچے کونے میں نگاہ بہو کے محرم پر پڑ جاتی۔ تب ان کی ہمت جواب دے جاتی۔ اور وہ شتابی کمرے سے نکل بھاگتے۔ جیسے سانپ کا بچہ بل سے باہر آ گیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگی ——— اوم نموم بھگوتے واسو دیوا ———

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک

پہنچادی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے۔ اور کہتے: "ہم تو دھنیہ ہو گئے، امی چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت۔ الاجیو آیا۔" اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں جہاں دق کے عارضے تھے۔ دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چونیٹوں کے بل، نگاہ قریب کی تو موٹے موٹے گدرائے ہوئے جسم والے کئی بچے بغل میں جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اترتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی لودر آرہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولھے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جا رہی ہے۔ اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ سبھی ایک سے — جڑواں۔ توام ...... اوم نمو بھگوتے —

آس پاس کے سب لوگ جان گئے تھے۔ اندو بابو جی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے۔ اور پھر ایک دم سلام دین گوجر نے فرمائش کر دی۔ اندو نے کہا۔ "بی بی! میرا بیٹا آر۔ ایم۔ ایس میں قلی رکھوا دو۔ اللہ تم کو اچھا دے گا۔" اندو کے اشارے کی دیر تھی۔ کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہو گیا۔ وہ بھی سارٹڈ، جو نہ ہو سکا اُس کی قسمت، آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اُس کی صحت کا بابو جی خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو بالائی میں پھینٹ، گلاس میں ڈال، بہو کو پلانے کے لئے اُس کی کھٹیا کے پاس آجاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی۔

"نہیں بابو جی مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"تیرا تو سسر بھی پیے گا۔" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ پی لیجئے نا۔" اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی۔ اور بابو جی ایک مصنوعی غصے سے برس پڑتے۔ "تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی۔"

ہُوں ــــ ہوں ــــ اندو لاڈ سے روٹھنے لگی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے! روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابوجی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اُسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے ــــ اور "لے یہ پڑا ہے ــــ تیری مرضی ہے پی ــــ نہیں مرضی تو نہ پی ــــ" کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر دھنی رام دلاری منّی کے پاس کھیلنے لگتے۔ دلاری کو بابوجی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پھر پیٹ پر منھ رکھ کر پھنکڑا پھلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابوجی اور منّی یہ کھیل کھیل رہے تھے۔ ہنس ہنسا رہے تھے، تو منّی نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دودھ تو خراب ہو جائے گا بابوجی۔ بھابی تو پیتی ہی نہیں!"

"پیئے گی ضرور پیئے گی بیٹا ــــ" بابوجی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو لپٹاتے ہوئے کہا۔ "عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں!"

ابھی یہ فقرہ بابوجی کے منھ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے "ہش ــــ ہے خو کھالی" کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا بہو بلّی کو بھگا رہی ہے اور پھر غٹ غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو ــــ بھابی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن بابوجی کے پاس آتا اور کہتا۔ "بوجی ــــ بھابی رو رہی ہے۔"

"ہائیں!" بابوجی کہتے اور پھر اُٹھ کر اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے، جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن سے کہتے۔ "جا ــــ تو سو جا ــــ وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ!"

اور پھر لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے۔ اور اپنے من میں بھگوان سے پوچھتے ــــ "چاندی کے ان کھلتے بند ہوتے ہوئے

——— پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے ۔" اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا۔ اور کانوں میں مسلسل ایک ہاؤ کی آواز سنائی دیتی۔ جسے سنتے ہوئے وہ کہتے۔" جیسے دنیا ہی بے انسان گنتا رہا ہے! " اور وہ روتے روتے سو جاتے۔

اندو کے جانے سے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا۔ اس نے لکھا۔ میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے قبض ہو گئی ہے، گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکٹ بھیج دیتے ہیں۔ مدن نے بابو جی کے ایک دوست سے تصدیق کی چٹھی لکھوا بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار ——— جوابی۔

جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندو سے دو دن سیدھے منہ بات ہی نہ کی۔ یہ دکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پا کر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی۔" اتنا منہ پھلائے بیٹھے ہو ——— میں نے کیا کیا ہے؟"

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔" چھوڑ ——— دور ہو جا میری آنکھوں سے ——— کمینی ——— "

" یہی کہنے کے لئے اتنی دور سے بلوایا ہے؟"

" ہاں!"

" ہٹاؤ اب۔"

" خبردار ——— یہ سب تمھارا ہی کیا دھرا ہے۔ جو تم آنا چاہتی تو کیا بابو جی روک لیتے؟"

اندو نے بے بسی سے کہا۔" ہائے جی ——— تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بلا کر بابو جی پر تو بڑا ظلم کیا ہے۔"

" کیا مطلب؟"

" مطلب کچھ نہیں ——— ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں۔"

"اور میرا جی؟"

"تمھارا جی؟" ۔۔۔ تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔" اندو نے شرارت سے کہا اور اس طرح
کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے
کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور بولا "بابو جی تم سے
خوش تھے۔؟"

"ہاں!" اندو بولی۔ "ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اپنی قسم!"

"اپنی قسم نہیں ۔۔۔۔ میری قسم کھاؤ۔"

"تمھاری قسم تو میں نہیں کھاتی ۔۔۔۔ کوئی کچھ بھی دے۔"

"ہاں!" مدن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔"

"سیکس؟" اندو نے پوچھا وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔"

"ہائے رام!" اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "گندے کہیں کے ۔۔۔۔ شرم نہیں
بابو جی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟"

"تو بابو جی کو نہ آئی تجھے یوں دیکھتے ہوئے؟"

"کیوں؟" اندو نے بابو جی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش
ہوں گے۔"

"کیوں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو۔"

"تمھارا من گندا ہے۔" اندو نے نفرت سے کہا۔ "اسی لئے تمھارا کاروبار بھی گندے برو
تمھاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمھیں اور تمھاری کتابوں کو اس

کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب میں بڑی ہو گئی تھی۔ تو میرے پتا جی نے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا وہ بھی .... وہ تھا بھگوڑا ـــــ جس ابھی نام لے رہے تھے" اور پھر اندو بولی۔ "بابوجی کو یہاں بلا لو۔ ان کا وہاں جیا بھی لگتا۔ وہ دُکھی ہوں گے تو کیا تم دُکھی نہیں ہو گے۔؟"

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر میں ماں کی موت نے بڑا ہونے سب سے زیادہ اثر مدن ہی پر کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو آنکھیں موند کر پرارتھنا شروع کر ـــــ اوم نمو بھگوتے واسو دیوا۔ اوم نمو .... اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ چھتر چھایا بھی سر سے اُٹھ جائے۔ خاص طور پر ایسے میں جب کہ وہ اپنے کاروبار کو جم نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا: "ابھی رہنے دو بابو شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔"

تیسرے چوتھے روز بابوجی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شوربانیوں میں دُھل گئے تھے۔ لکھا تھا: "بہو کے ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے، تمھاری ماں کے دن، جب ہماری نئی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الھڑ تھی۔ ایسے ہی اُتارے ہوئے کپڑے اِدھر اُدھر پھینکا اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندوق، وہی بیسیوں خلمجگی۔ میں بازار ہوں۔ آ رہا ہوں۔ کچھ نہیں تو دہی بڑے یا ربڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا، خالی ہے......" اور پھر ایک آدھ سطر اور درد تھی۔ آخر میں لکھا تھا: "دفتر سے لوٹتے سمے، یہاں کے بڑے بڑے اندھیرے کمروں میں دا ہوتے میرے من میں ایک ہول سا اُٹھتا ہے......" اور پھر ـــــ "بہو کا خیال رکھ کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔"

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چٹھی پکڑ لی۔ سانس کھینچی، آنکھیں پھیلاتی شرم سے پانی پانی ہوتی ہوئی بولی: "میں مر گئی۔ بابو جی کو کیسے پتہ چل گیا۔؟"

مدن نے چٹھی چھڑاتے ہوئے کہا۔ "بابو جی کیا بچے ہیں؟ —— دنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے!"

"ہاں مگر۔" اندو بولی: "ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں!"

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور جیسے بابو جی یا کوئی اور دیکھ رہا ہو۔ اس نے ساری کا پلو اس پر کھینچ لیا۔ اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی: "تمھاری سسرال سے شیرینی آئے گی۔"

"میری سسرال؟ —— اوہاں" مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا: "کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کے ہوئے ہیں اور چلا آیا ہے" اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں —— تسلی سے۔

"چلا آیا ہے یا تم لائے ہو؟"

"تم —— یہ سب قصور تمھارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں!"

"تمھیں پسند نہیں۔؟"

"ایک دم نہیں!"

"کیوں؟"

"چار دن تو مزے لیتی زندگی کے!"

"کیا یہ جندگی کا مجا نہیں؟" اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا۔ مرد عورت شادی کس لیے کرتے ہیں؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا نا؟ پوچھو ان سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ

کرتی ہیں۔ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سادھیوں مجاوروں پر چوٹیاں باندھتی، شرم وحیا تج کر دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی، شمسانوں میں مسان جگاتی۔

"اچھا! اچھا!" مدن بولا "تم نے بکھان ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لئے تھوڑی عمر پڑی تھی۔؟"

"ہو گا تو!" اندو نے سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تمھارا نہیں، میرا ہو گا۔ تمھیں تو اس کی ضرورت نہیں، پر اس کے دادا کو بہت ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔!"

اور پھر کچھ جھل، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پا لینے کے سلسلے میں، اس جان کا ہوتا سوتا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی اس نے منہ سے نہ نکالا۔ اندو نے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹن کے خاص انداز میں بولی "وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب تیچھے ہو گا۔ پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں...... مجھے بچپن ہی سے وہم ہے اس بات کا۔"

مدن بھی جیسے خائف ہو گیا ــــ یہ خوبصورت "چیز" جو حاملہ ہو جانے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے مر جائے گی؟ اس نے پیٹھ کی طرف سے اندو کو تھام لیا۔ اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا "تجھے کچھ نہ ہو گا اندو........ میں تو موت کے منہ سے بھی چھین کر لے آؤں گا تجھے ــــ اب ساوتری کی نہیں، ستیہ وان کی باری ہے ــــ"

مدن سے لپٹ کر اندو بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے......

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہ لکھا۔ البتہ سہارنپور سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا۔ اندو رونے لگی۔ سارٹر کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن

آنکھیں موند لیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا ——— اوم نمو بھگوتے ....

دوسرے روز ہی مدن نے باپ کو چٹھی لکھی ——— بابوجی! چلے آؤ...... بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی ——" لیکن آخر نوکری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔ دھنی را م کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے..... ان کے بارے میں دن بہ دن مدن کا احساسِ جرم بڑھنے لگا۔" اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑ جاتا ——؟"

وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کے عالم میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی۔ اور بولی۔" مبارک ہو بابوجی ——— لڑکا ہوا ہے۔"

لڑکا ؟ مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا۔" بی بی کیسی ہے"؟

بیگم بولی۔" خیر مہر ہے ——— میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے.... زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا۔"

" او......" مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور کمرے میں جانے کے لئے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی۔" تمہارا اندر کیا کام"؟ اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی۔ یا شاید اس لئے کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو ارد گرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں۔ گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا کہ جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی تھیں...... زچگی کے لئے چکلی بھابی تو نہ آئی تھیں کیونکہ اس کا اپنا بچہ تو بہت چھوٹا تھا۔ البتہ دریا باد والی پھوپھی ضرور پہنچی تھیں جس نے پیدائش کے وقت رام، رام، رام، رام کی رٹ لگا دی تھی۔ اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی۔

زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اس قدر فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا۔ اور پھوپی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آرہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

—— " اندو ٹھیک ہے نا پھوپھی ۔؟"

" ٹھیک ہے ٹھیک ہے، ٹھیک ہے! پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی ——

پھوپھی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی بچے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر منی کے پاس لیٹ گئی۔ اوندھی —— اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا ...... پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گذر چکی ہے، پھر کیوں اس کی روح کانپ اٹھی ہے ——

پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا۔ جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا۔ جس میں کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اُڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی ایک نرگھلی سی آواز آئی ——

" ہائے —— ئے ——" اور پھر بچے کے رونے کی آواز۔"

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبا دیا۔ کتوں کو اندر آنے سے روکا لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اُسے ہوش آیا ہے، کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور

—— نند اور جسودھا —— اور دوسری طرف نندلال...... اندو نے بچے
...ف دیکھا اور کچھ ٹوہ لینے کے سے انداز میں بولی "بالکل تم ہی پر گیا ہے۔"
"ہو گا" مدن نے ایک اچٹتی ہوئی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا "میں تو کہتا ہوں
ہے بھگوان کا کہ تم بچ گئیں۔"
"ہاں!" اندو بولی "میں تو سمجھتی تھی ——"
"شبھ شبھ بولو" مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہاں تو جو کچھ
ہے...... میں تو اب تمھارے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا" اور مدن نے زبان دانتوں
...لی۔"
"توبہ کرو" اندو بولی۔
مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھ سے پکڑ لئے...... اور اندو خفیف آواز میں
...نگی۔
...بچہ ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس
...تلاش کر رہی تھی۔ جو اب اس سے پرے، باہر کی دنیا میں جا کر اپنی اصلی ماں کو بھول
...ا۔ اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اس دنیا کو تک رہی تھی — معلوم ہوتا
...ں نے مدن ہی کے نہیں دنیا بھر کے گناہگاروں کے گناہ معاف کر دیئے ہیں اور دیوی
...یا اور کرونا کے پرساد بانٹ رہی ہے...... مدن نے اندو کے منھ کی طرف دیکھا
...چنے لگا۔ اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دبلی ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی
...... جبھی ایکا ایکی اندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لئے۔
"کیا ہوا؟" مدن نے پوچھا۔
"کچھ نہیں" اندو تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کر کے بولی "اسے بھوک لگی ہے"
...ں نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے ؟ ——— بھوک ؟ ——— مدن نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اندو کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمھیں کیسے پتہ چلا۔؟"
"دیکھتے نہیں" ؟ اندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی "سب گیلا ہو گیا ہے!"
مدن نے غور سے ڈھیلے ڈھالے گلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دودھ بہہ رہا تھا۔
اور ایک خاص قسم کی بو آ رہی تھی۔ پھر اندو نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"اسے مجھے دے دو!"
مدن نے ہاتھ پنگھوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام
لیتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اُٹھایا جیسے وہ کوئی مرا ہوا چوہا ہے۔ آخر اس نے بچے کو ماں
کی گود میں دے دیا۔ اندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم جاؤ ——— باہر"
"کیوں ؟..... باہر کیوں جاؤں" ؟ مدن نے پوچھا۔
"جاؤ نا"۔ اندو نے کچھ مچلتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا "تمھارے سامنے میں دودھ نہ
پلا سکوں گی!"

"ارے" ؛ مدن حیرت سے بولا "میرے سامنے ؟....... نہیں پلا سکے گی!" اور پھر
ناسمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس
مڑتے ہوئے اندو پر ایک نگاہ ڈالی ——— اتنی خوبصورت اندو آج تک نہیں لگی تھی۔
بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو
نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا
جو چوبیس گھنٹے انھیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر منا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس
بُری حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے۔ بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھنی کے برابر پندر
گولیاں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن انھیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تا

چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے سے ہی بالٹی ایک چوتھائی ہو گئی تھی۔ رات انھیں تسلّی سی محسوس ہونے لگی اور انھوں نے پکارا ——" بہو ذرا داتن تو دینا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔" بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے کر آئی۔ بابو جی اُٹھ کر داتن چبا ہی رہے تھے کہ ایک ابکائی آئی۔ ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں۔ اور کوئی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا ——

منّی کو پیدا ہوئے کل بیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے منھ نوچ کر، سر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا۔ جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کے بجائے اتار کر رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹّی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ "لوگو! میں لٹ گئی!" کی جگہ اس نے ایک دل دوز آواز میں چلّانا شروع کر دیا تھا۔ "لوگو! ہم لُٹ گئے!"

گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا۔ اس کا ابھی مدن کو پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منھ میں آ گیا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا۔ اگر وہ گھر کے باہر بدرو کے کنارے سیل چڑھی مٹّی پر اوندھا لیٹ کر اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا..... دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچّے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچّے کندن، دلاری منّی، پاشی یوں چلّا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بوٹ چیں چیں، اُٹھا اُٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انھیں اگر کوئی پروں کے اندر سمیٹتی ہے تو اندو ——

نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو یہ دنیا میرے لئے ختم ہو گئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ وہ اٹھا! ذرا اٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے
مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دُہرایا ـــــ "میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟"
اور وہ کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی تھی۔
باپ کو آگ میں حوالے کرنے سے پہلے مدن ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت
کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔
اُس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتہ دار محلہ والے سن سے رہ گئے۔
پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی
جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی...... عورتیں باہر ہی سے شمشان کے کنویں
پر سے نہا کر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لئے جو
طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی۔ رات کے گھر آنے پر پھر سے ہول میں ڈھل گئی..... اسے کوئی سہارا چاہئے تھا۔
کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی جنک دلاری اندو نے
کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی باہوں میں لے لیا....... اس رات کو اگر اندو
اپنا آپ یوں مدن پر نثار نہ کر دیتی تو اتنا بڑا دکھ مدن کو لے ڈوبتا۔
دس ہی مہینے کے اندر اندر اندو کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی
آگ میں ڈھکیل کر مدن خود اپنا دکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا اگر میں شادی
کے بعد بابوجی کے پاس گئی ہوتی اندو کو نہ بلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے۔ لیکن
پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا......
کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا ـــــ مجبوراً چل نکلا ـــــ
ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر، چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اندو
میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے منا طرح طرح کی ضد کرتا تھا۔ جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں بھی۔
میکے سے اندو کا خط آیا ـــــ مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے، اُسے

کوئی مارتا تو نہیں؟ .... مدن کو بڑی حیرت ہوئی ـــــ ایک جاہل ان پڑھ عورت ...... ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟ ـــــ پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا ـــــ یا یہ بھی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے ـــــ؟

سال گزر گئے۔ پیسے کبھی اتنے نہ آئے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے۔ لیکن گزارے کے مطابق مدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دقت اس وقت پر ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آجاتا.... کندن کا داخلہ دینا ہے، دلاری منی کا شگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا۔ اور پھر اندو ایک طرف سے آتی مسکراتی ہوئی۔ اور کہتی "کیوں دکھی ہو رہے ہو؟" مدن اُمید بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا "دکھی نہ ہوں؟ کندن کا بی اے کا داخلہ دینا ہے.... منی...." اندو پھر ہنستی اور کہتی "چلو میرے ساتھ" اور مدن بیٹھو کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا۔ مر وگی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا" اور اندو کہتی "ہاں! لے جاؤں گی" پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟"

"کہیں سے بھی آئے ..... تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے"

"پھر بھی؟"

"تم جاؤ اپنا کام چلاؤ"

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی "میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے نا" اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی "میں بڑا لیٹرا ہوں ـــــ تم نہیں جانتے؟ سخی اور لیٹرا ـــــ جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے غریب غربا کو دے دیتا ہے"..... اسی طرح منی کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی

لوٹ کے زیور بکے۔ قرضہ چڑھا اور پھر اُتر بھی گیا۔

ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔ ان شادیوں میں اندو ہی "ہتھ بھرا" کرتی تھی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابو جی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اوپر ماں اور بابو جی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے بابو جی سے کہا: "تم تو بہو کے ہاتھ کی پکی کھا آئے ہو۔ اس کا سکھ بھی دیکھا ہے۔ پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔" اور یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شیو تک پہنچا۔ انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا —— اور یوں ماں، مات لوک میں آکر بہو کی کوکھ میں پڑی —— اور اندو کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی......

پھر اندو ایسی دیوی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو نند دیور تو کیا خود مدن سے بھی لڑ پڑتی —— مدن راست بازی کی اس پتلی کو خفا ہو کر ہریش چندر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں الجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے۔ اس لیے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے نیچی رہتی تھیں۔ جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے مدن اپنے شوہری زعم میں کتنا بھی اندو کی بات کو رد کر دے لیکن آخر سب ہی سر جھکائے ہوئے اندو ہی کی شرن میں آتے تھے۔ اور اسی سے چھما مانگتے تھے۔

نئی بھابی آئی کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی۔ لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کے الٹ چھوٹی بھابی رانی ایک بیوی تھی۔ جسے عورت کہتے ہیں رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا۔ اور بیچ۔ پی چاچا کی معرفت جائداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائداد تو ایک طرف اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آگئیں۔ اور اندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ ہو جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے

نہیں بس سکے تھے۔ وہاں اندو کا نیا گھر دنوں ہی میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔
بچّی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچّی ہر وقت اندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی جہاں نسبھی گوشت کے اس لوتھڑے پر تھو تھو کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی۔ لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اٹھتی۔ اور بچّی کو سامنے جھلنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اُٹھتی۔ "تو مجھے بھی جینے دے گی ——— ماں ——— ؟"
اور بچّی چلاّ چلاّ کر رونے لگتی۔
مدن اندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ بکنے لگا۔ اور مدن نے بہت سا روپیہ اندو سے بالا بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے کے بعد کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔
گویا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے منھ کے پاس پھنکارنے لگی۔ بلکہ بار بار پھنکارنے لگی۔ شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی۔ لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سایے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے اور اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور لہر آ کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اُڑ گیا۔ یا کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منھ پوری طرح سے ڈھانپ لیا۔ اور کوئی سانس لینے کے لئے تڑپنے لگا۔ جبھی روشنی کی چوکور لہر ایک چوکھٹا سی بن گئی۔ اور اس میں ایک صورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا جیسے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتا رونے لگا۔ اوپر طبل نے اس کی آواز ڈبو دی۔
مدن کو اس کے تصور کے خدّوخال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک خط غلط لگ گیا۔ یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی۔ اور

مدن ـــــ دلنغ صناعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا۔

سبیلے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے سبیلے کے سامنے پیش کیا۔ پیش ہی نہیں کیا بلکہ مُنہ پر ملا۔ اس کو اٹھا کر سبیلے نے بیگم کے منہ پر دے مارا۔ معلوم ہوتا تھا کسی خونین تربوز کا گودا ہے جس کے رگ و ریشے بیگم کی ناک اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں۔ کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گودا اور بیج اُٹھائے اور اندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیئے

ایک اندو کے بجائے دو اندو ہو گئیں۔ ایک تو اندو خود تھی۔ اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط۔ جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ اور جو نظر نہیں آرہا تھا .... مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر...... نہا دھو، اچھے کپڑے پہن گھنو کی ایک گلوری جس میں خوشبودار قوام لگا ہو، منہ میں رکھ کر....... لیکن اس دن جو مدن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی۔ اس نے چہرے پر پوڈر تھوپ رکھا تھا۔ گالوں پر رُوج لگا رکھی تھی۔ لپ اسٹک کے نہ ہونے پر ہونٹ ماتھے کی بندی سے رنگ لئے تھے ـــــ اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

"کیا بات ہے؟" آج مدن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔ اندو نے مدن سے نظریں بچاتے ہوئے کہا "آج فرصت ملی ہے۔"

شادی کے پندرہ بیس برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی۔ اور وہ اس وقت جب چہرے پر چھائیاں چلی آئی تھیں۔ ناک پر ایک سیاہ کاٹھی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تہیں سی دکھائی دینے لگی تھیں...

آج اندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی ـــــ یوں بنی ٹھنی۔ کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی ـــــ "یہ نہیں ہو سکتا ـــــ" مدن نے سوچا اور اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے پھر ایک بار مڑ کر اندو کی طرف دیکھا

جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں —— وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی .... یہاں جو غلط خط لگے تھے، شرابی کی آنکھوں کو نہ دیکھ سکے...... اندو سچ مچ خوب صورت تھی۔ آج بھی پندرہ سال کے بعد پھولاں، رشید، مسز رابرٹ اور ان کی بہنیں ان کے سامنے پانی بھرتی تھیں ...... پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر ——

آسمان پر کوئی خاص بادل بھی نہ تھے۔ لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا ادھر گھر کی گنگا طغیانی پر تھی، اور اس کا پانی کناروں سے نکل نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی رفتار سے اگر پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا..... ادھر بچی رونے لگی۔ ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی۔ مدن نے اس کی آواز سن کر آنکھیں بند کر لیں۔ کھولیں تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ جوان عورت بن کر —— نہیں نہیں، وہ اندو تھی، اپنی ماں کی بیٹی، اپنی بیٹی کی ماں۔ جو اپنی آنکھوں کے دنبالے سے مسکرائی۔ اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن ہرمل کی دھرتی نے مدن کو چکرا دیا تھا۔ آج جس کی خوشبو نے بوکھلا دیا تھا۔ ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس لئے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے رستا ہوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا...... لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا۔ اس نشے میں اس کی آنکھیں سمٹنے لگیں اور نفس تیز ہو کر انسان کا نفس نہ رہا۔

"اندو —— " مدن نے کہا۔ اور اس کی آواز شادی کی رات والی پکار سے دو سُر اوپر تھی —— اور اندو نے پرے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جی"۔ اور اس کی آواز دو سُر نیچے تھی.... ...... پھر آج چاندنی کے بجائے اماوس تھی........

اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر

مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ اور دیکھنے لگا۔ اس نے کہا کھویا، کیا پایا ہے؟
اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

"یہ کیا؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا۔ "تمھاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔"

"یوں ہی۔" اندو نے کہا اور بچّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "رات بھر جگایا ہے اس چڑیل منیا۔ نے۔"

بچّی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گویا وہ دم سادھے دیکھ رہی تھی۔ اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ واقعی آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔
مدن نے پھر غور سے اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں مگر یہ آنسو؟"

"خوشی کے ہیں۔" اندو نے جواب دیا۔ "آج کی رات میری ہے۔" اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے وہ مدن سے چمٹ گئی۔ ایک تلذذ کے احساس سے مدن نے کہا۔ "آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی اندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا ——

لیکن تم نے کہا نہیں۔" اندو بولی۔ "یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟"

"ہاں!" مدن بولا۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو۔"

"تم نے کچھ نہیں مانگا مجھ سے ——"

"میں نے؟" مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "میں کیا مانگتا۔؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار —— ان کی تعلیم، بیاہ شادیاں —— یہ پیارے پیارے بچے —— یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔"

"میں بھی یہی سمجھتی تھی۔" اندو بولی۔ "لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔" پھر اندو نے رک کر کہا۔ "میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔"

"کیا چیز رکھ لی؟"

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منھ پرے کرتی ہوئی بولی" اپنی لاج ۔
ی خوشی ...... اس وقت تم بھی کہہ دیتے ــــ اپنے سکھ مجھے دے دو ــــ
یں ...."

اور اندو کا گلا رُندھ گیا ۔

اور کچھ دیر بعد بولی ۔" اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا!"
مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ۔ وہ زمین میں گڑ گیا ۔ یہ اَن پڑھ عورت ؟
ــــ کوئی رٹا ہوا فقرہ ــــ ؟ نہیں تو .... یہ تو ابھی سامنے کی زندگی کی
ٹی سے نکلا ہے ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں
ت اُڑ رہا ہے ......

کچھ دیر بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے ۔ اور بولا " میں سمجھ گیا اندو" ۔ پھر روتے
ے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے ــــ اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور
ے ایسی دنیاؤں میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے ....

ٹ تیرا افسانہ

احمد ندیم قاسمی

رئیس خانہ

خاکستری رنگ کے پتھروں کی اس عمارت کو بڑے لوگ مسافر خانہ اور چھو لوگ رئیس خانہ کہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ بڑے لوگوں کے لئے ڈاک بنگلہ موجود تھا اور چھو لوگ سرائے میں ٹھہرتے تھے۔ جہاں صبح اور شام کو وہ بھٹیارے کے پاس تنور کے ارد گ بیٹھ کر موٹی موٹی روٹیوں پر دال کی ڈھیریاں لگا کر کھاتے۔ رئیس خانے کے چوکی کی بیوی مریاں اور ڈاک بنگلے کے مالی کی بہن بہشتو کے حسن کا مقابلہ کرتے اور چٹخا بھرتے۔ اور لگے ہاتھوں ایک نظر بھٹیارے کی بیوی پر بھی دوڑا لیتے جس کے بارے مشہور تھا کہ وہ کسی ریاست کی رانی ہے اور بھیس بدل کر بھٹیارن بنی پھرتی ہے اور ادھر رئیس خانہ کا یہ عالم تھا کہ وہاں رئیس آتے ہی نہ تھے۔ لے دے کر کبھی کبھ شکاری نوجوانوں کی کوئی ٹولی ہرنوں کی تلاش میں یہاں نکلتی تو رئیس خانے میں آ جاتی۔ اس روز فضلو چوکیدار بڑی امید دل سے چھت کے جالے اتارتا۔ برآمدے گوشوں میں پڑی ہوئی دلدل اور پتا در کو باہر پھینکتا۔ اور اکلوتے گلدان کے ۔ ودا۔

اور جلے ہوئے پھولوں کو گرا کر ڈاک بنگلے کے مالی سے نئے پھول مانگ لاتا۔ اور
جب شکاری رخصت ہو جاتے تو فضلو کو دوسری عمارتوں کے سب چوکیدار پرلے درجے
کے جھوٹے اور مکار نظر آنے لگتے۔ جو اسے بڑی بڑی "بخششوں" کے قصے سناتے اور بتاتے
کہ جتنے روز وہ صاحب ان کے یہاں رکے ہیں انھوں نے پلاؤ، فیرنی اور قورمے کے سوا اور
کوئی چیز چکھی ہو تو ان کی زبان پر پھوڑا نکلے۔ فضلو میاں سے ان چوکیداروں کی
لافوں کا ذکر کرتا تو وہ کہتی یہ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ ان کی بیویوں، بیٹیوں کو کبھی دیکھا
ہے تم نے؟ ایسا ریشم پہنتی ہیں کہ بالکل پٹیالے کی رانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ فاطمہ چوکیدارن
آج چشمے پر کپڑے دھونے آئی تھی، میں نے کہا "فاطمہ، شرم نہیں آتی، ننگے سر چشمے پر
چلی آئیں۔ پہلے تو وہ زور سے ہنسی پھر مجھے پاس بلا کر بولی: "اور تمھیں شرم نہیں آتی کہ
میں نے سو روپے کا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے اور تم مجھے ننگے سر دیکھ رہی ہو، اور میں نے غور
سے دیکھا تو فضلو نے ایسا مہین دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا کہ مکڑی کا جالا کیا چیز ہے۔
وہ بچھو کی سی مونچھوں والا ایک صاحب آیا تھا نا جس کی بیوی بچوں کی جگہ کتے پالتی
تھی، وہی دلوا گیا اپنی بیوی سے۔ اور یہاں ہمارے صاحب رئیس خانے کی صابن دانی
تک چرالے گئے۔ اور وہ شکاری رئیس شیر دل کو ایک چونی دے گئے تھے۔ کٹے ہوئے کان
والی، حرام زادے"۔

"سور کے بچے!" فضلو میاں کی تائید کرتا۔

یہ رئیس خانہ کوہستان نمک کی سب سے اونچی چوٹی سکیسر پر تھا۔ سردیوں میں
پہاڑ بادلوں اور دھند میں لپٹا رہتا تھا۔ دور سے یوں نظر آتا جیسے کوئی بڑھا پھیرن
نہیں نہایا۔ یہاں کی چوٹیوں اور نشیبوں میں بکھرے ہوئے بنگلوں کی چمنیوں پر اُلّو
بولتے اور منڈیروں پر بلیاں لڑا کرتیں۔ بنگلوں کے پہلو کی کوٹھریوں میں چوکیدار اور
ان کے بیوی بچے دوپہر تک کھاٹوں کھٹولوں پر پڑے سکڑا کرتے: اور پھر دھوپ کی

ڈھنڈیا پڑی رہتی۔ لیکن جوں ہی بہار کا پہلا جھونکا درختوں کی سوکھی ہوئی شاخوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے دلنے سے ٹانک جاتا۔ اور چٹانوں کی دراڑوں تک سے نرم نرم گھاس پھوٹ پڑتی۔ جب نیچے وادی سے ہریالی کی مہک بلندی پر آتی اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اترتی۔ اور ولوی میں منتشر ہو جاتی اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا اور پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے کھیت دور دور تک لہلہا اٹھتے تو بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی۔ چوکیداروں کی بیویاں اور بچے جالے اتارتے اور شیشے دھوتے۔ مالی باغیچوں میں سے خزاں کا ملبہ اٹھاتے اور قسم قسم کی پنیری لگاتے۔ دکان دار میدانوں کو چھوڑ کر خچروں پر دکانوں کا سامان لادے اوپر آجاتے۔ شام ہوتے ہی بنگلوں کے پہلو میں دبکی ہوئی کوٹھریوں کی کھڑکیاں جاگ اٹھتیں۔ اور ہر طرف عید کی رات کی سی ہماہمی طاری ہو جاتی۔

اور پھر بڑے بڑے آدمیوں کے بڑے بڑے خاندان لمبی لمبی موٹروں میں بھرے ہوئے سکیسر کی چکراتی ہوئی سڑک پر تیرتے ہوئے آتے۔ چوکیداروں اور مالیوں کے بچے موٹروں کے شیشوں میں سے امیر لوگوں کے گورے گورے بچوں کو دیکھتے تو ان کے پیچھے بھاگتے اور جب موٹر کسی بنگلے میں چلی جاتی۔ تو وہ گیٹ سے لگ کر منہ کھولے کھڑے ہو جاتے۔ اور جب امیر بچے کاروں سے اترتے اور اتفاق سے ان کی نظر گیٹ کی طرف اٹھ جاتی تو چند جری قسم کے غریب بچے فوراً سلام کرتے۔ ادھر سے سلام کا جواب مل جاتا تو وہ شرمیلے اور بزدل بچوں کی طرف فخر سے دیکھتے اور کہتے "دیکھا! ہمیں سلام کا جواب ملا ہے۔ اب ہمیں بلّے اور گیندیں اور پرانے بوٹ ملیں گے انعام میں۔ اور تم بیٹھے دیکھا کرو، سؤرو، بڑے آدمیوں کو جھک کر سلام کرنا چاہیئے۔ بڑا ثواب ملتا ہے۔"

افسروں کے بعد ڈاک بنگلے میں قسم قسم کے صاحب آتے چند روز کے لئے رکتے پھر چوکیدار اور مالی کو بخششیں بانٹتے۔ میدانوں میں اتر جاتے۔ چند لوگ عالی جنا

صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کو سلام کرنے کا فخر حاصل کرنے آتے۔ چند اپنی جاگیروں کے مقدمات کے سلسلے میں، چند گھی کے کنستر، انڈوں کی ٹوکریاں اور بٹیروں کے پنجرے ڈالی کے طور پر پیش کرنے کے ضمن میں ——— ان میں سے بہت ہی کم تعداد ایسے صاحبوں کی ہوتی جو محض سکیسر کو دیکھنے آتے۔ کبھی کبھی جوگیوں کی ٹولیاں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سکیسر کی گھاٹیوں میں رینگتی ہوئی اوپر آتیں تو رات سرائے میں ٹھہر کر صبح کو پہاڑ کی دوسری طرف اتر جاتیں، یا نوجوان شکاری ہرنوں کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے سکیسر کے قریب پہنچتے تو دور سے چمکتے ہوئے بنگلوں اور چمنیوں سے نکلتی ہوئی نیلے دھوئیں کی دھاریاں دیکھ کر اوپر آجاتے۔ یہاں وہ رات رئیس خانے میں گزارتے اور چوکیدار کی آنکھ بچا کر منہ اندھیرے ہی نیچے اتر جاتے۔

"سوّر کے بچے"۔ فضلوان صاحبوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتا۔

"حرام زادے"۔ مریاں ان کے بارے میں رائے ظاہر کرتی۔

ایسے ہی شکاریوں میں سے کسی نے چپکے سے کھسکتے وقت رئیس خانے کی صابن دانی کو بھی اپنے تھیلے میں رکھ لینا مناسب سمجھا۔ اسی لئے فضلو بے تحاشا حقہ پیتا۔ مریاں اس کے پاس بیٹھی "ابا بیلی" پر سوت چڑھاتی یا شیرو کے سر سے جوئیں چنتی اور ہر جوں پر اُسے "حرام زادہ" کہتی۔

سکیسر کے مشرق میں پھیلی ہوئی وادی کو "سون" کہتے ہیں۔ یہاں کے دیہات میں یہ کہاوت مشہور تھی کہ ساون ہر سال سکیسر کی چوٹی پر جنم لیتا ہے۔ اور پھر وہاں سے اتر کر سون کے سبزہ زاروں پر برستا ہے۔ سون والوں کی نظریں بارش کے انتظار میں بجائے آسمان کے سکیسر کی طرف اُٹھتیں۔ چھٹی پر آئے ہوئے فوجی جوان دوربینیں لگاتے، چمکتے ہوئے سفید بنگلے قریب آجاتے۔ گھنے درختوں کے جھرمٹوں میں کبھی کبھی کوئی کار رینگتی دکھائی دے جاتی۔ لیکن انھیں تو چوٹی کے آس پاس کہرے کی اس دھجی کی تلاش ہوتی جو ... تا رات کی رات پھیل کر بادل بن جاتی تھی۔ اور پھر سکیسر کی بلندیوں کو دھو کر پہاڑی ڈھلانوں

سے چڑھتے ہوئے دیہات کا رُخ کرتی تھی۔ جو سکیسر پر سے کچھ یوں نظر آتے تھے۔ جیسے ذ
ٹھوکر سے سارا گاؤں ڈھلان پر سے پھسلتا ہوا میدان میں آ رہے گا۔

لیکن اب کے ساون نے سکیسر کی چوٹی کے بجائے سون کے ایک گاؤں پر جنم لیا
سکیسر والے نیچے وادی میں اور پہاڑیوں کے افق تک پھیلتے ہوئے طویل سلسلوں پر بارش
دیکھتے رہے۔ اور سکیسر کے حصے میں صرف نم آلود ہوائیں آئیں۔ جنوب اور مغرب میں خوشا
اور میانوالی کے چٹیل میدانوں سے لو کے طوفان اُٹھتے۔ ادھر شمال اور مشرق میں بکھرا
سون کی ڈھلی ہوئی گھاٹیوں میں سے خنکی لپکتی اور سکیسر کے بنگلوں کے پردوں کو ایک
پُراسرار ہوا چھیڑتی جو کبھی گرم ہوتی۔ کبھی ٹھنڈی اور کبھی محض مرطوب۔ اور بڑے لوگ
بلندیوں پر دوربینیں لگائے نیچے وادی پر بدلیوں کی دوڑیں دیکھتے۔ وادی کے حاشیے
کی پہاڑیوں کا پانی چاندی کی چادریں بن کر جھیل کی طرف بڑھتا۔ ٹینس کے میدان میں
بڑے لوگ کھیل بند کر کے سگریٹ پھونکتے اور جمائیاں لیتے اور جب وادی سے کوئی
جھونکا بھیگی ہوئی دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو کو اوپر سکیسر کی طرف اچھال دیتا تو وہ
انگڑائیاں لے لے کر نشیبوں کی طرف عجیب بے بسی سے دیکھتے، جیسے ساون قانون کی
میں آ سکتا تو اسی وقت عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نظر آتا۔

ان دنوں سکیسر کے ڈاک بنگلے میں ایک شخص قیام پذیر تھا۔ نہ وہ کسی اد
کو ڈالی دینے آیا تھا۔ اور نہ اس کا کوئی مقدمہ تھا۔ وہ سکیسر پر ساون گزارنے آ
تھا اور ساون کی اس شرارت سے بہت اُداس تھا۔ کہ سون میں ندیاں بہہ رہی ہیں
اور سکیسر کے چشمے تک خشک ہو چلے ہیں۔ برسوں سے ساون ہر سال سکیسر کی چ
پر جنم لیتا تھا۔ اس لئے وہ ساون شروع ہونے سے چند روز پہلے ڈاک بنگلے میں آ
اور اب ساون کی ساتویں تاریخ تھی۔ لیکن بارشیں نیچے نوشہرہ، انگہ اور اوچھا
دیہات میں ہو رہی تھیں۔ اور یہاں سکیسر کے درختوں پر ہلکی ہلکی گرد جم رہی تھی

اور یہاں کے رہنے والوں کی آنکھوں میں پیاس کی ویرانی بس گئی تھی۔ وہ شخص دن بھر ڈاک بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا کتابیں پڑھتا اور سگریٹ پیتا۔ شام کو وہ ٹینس کے میدان کے قریب سے گزرتا ہوا کھلاڑیوں سے بالکل بے نیاز آگے بڑھ جاتا۔ رئیس خانے کے پہلو والی سڑک سے ہوتا ہوا نیچے اترتا۔ کچھ دیر کے بعد واپس آتا۔ اور پھر ڈاک بنگلے کی ایک کھڑکی اور دو روشن دان بہت رات گئے تک چمکتے رہتے۔

فضلو کو ڈاک بنگلے کے مالی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ صاحب پچھلے سال بھی یہاں ساون گزارنے آیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے ڈاک بنگلے کی عمارت کی بہت مذمت کی اور کہا کہ رئیس خانے کی عمارت کا جواب سارے سکیسر میں نہیں۔ ایسا دل کشا مقام تینوں ڈپٹی کمشنروں کی کوٹھیوں کو بھی میسر نہیں آیا۔ اور مالی نے صاحب کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ کیونکہ رئیس خانے کی عمارت ڈراؤنی حد تک بے رونق تھی۔ اس کی پشت پر جو پہاڑی تھی اس نے مغرب کا سارا منظر چھپا رکھا تھا۔ اور اس کے مختصر سے صحن کے کنارے پر درخت اتنے گنجان تھے کہ نیچے وادی میں جھیل بھی جھکی ہوئی شاخوں میں سے بہت سے ستارے بن کر ہی جھلک پاتی تھی۔ دو سال سے یہ بات بھی مشہور ہو چلی تھی کہ رئیس خانے میں بھوت بسنے لگے ہیں۔ مالی کو صاحب کی بد مذاقی پر بہت افسوس ہوا تھا۔

"پھر وہ چلا گیا" مالی نے کہا۔

"ساون گزار کر یا پہلے ہی" فضلو کو دلچسپی ہو رہی تھی۔ کیونکہ ایک مدت کے بعد کسی صاحب کے سلسلے میں اُسے رئیس خانے کا نام سنائی دے رہا تھا۔

مالی بولا "یہ تو یاد نہیں، بس وہی دن تھے جب تم ساس کی موت پر مریاں کو ساتھ لئے نیچے وادی میں اترے تھے۔ ایک دن تم گئے۔ دوسرے دن صاحب نے پوری کا کرایہ بھرا اور چلا گیا۔ اور مجھے سو روپئے بخشش دے گیا۔"

"سو روپئے" فضلو کی حالت غیر ہونے لگی "پر یہ ہے کون ؟"

"کوئی بھی ہو"۔ مالی نے بے پروائی سے کہا۔ "ہمیں اس سے کیا مطلب بخشش ہے، سو وہ ملی، سوچو تو، ایک سو روپیہ معمولی رقم نہیں، مُنہ میں سماتی ہے، ہاتھ میں ایک بار نہیں اٹھائی جا سکتی"۔

فضلو کی بھوئیں جڑ گئیں۔ اور مَاتھے پر ایک قوسی شکن اُبھر آئی۔

"ایک سو"۔ اس نے کہا، "ہوش میں تو ہو؟"

"ارے بھئی ہاں ——— ہزار بار ہاں ——— پورے ایک سو پانچ بلیسیاں ——— چار پپیاں ——— اور پھر اتنا گرم اور نرم کمبل کہ ہاتھ لگا تو جانو تازہ حلوا چھو رہے ہو ——— یہ کمبل اس نے بہشتو کو دیا، اور بہشتو کا کام یہ کہ دو تین دن اس کے کمرے کے گلدان سجائے اور ایک بار تولیہ دھو دیا ——— بس ——— کوئی اللہ والا ہے۔!"

فضلو بخشیشوں کا ذکر سُن کر چڑ جانے کا عادی ہو چکا تھا۔ مگر جب مالی نے پہلے قرآن مجید کی اور پھر اپنی بیوہ بہن بہشتو کی قسم کھائی تو وہ کوئی غیر مرئی سا گولا نگل واپس اپنی کوٹھڑی میں آ گیا اور مریاں کو اس واقعے کا ذکر یوں سُنایا جیسے مالی نے اس کے ہاتھ مریاں ہی کے لئے ساری تفصیل بھجوائی ہے۔ مریاں نے لسی کے پیالے میں نمک کی چٹکی گھولتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے پوچھتی ہوں فضلو کہ جب رئیس خانے کی چوکیدار میں ہمیں اُڑتی دھول بھی نہیں ملتی۔ تو یہاں سکیسر پر کیوں ٹنگے پڑے رہیں کیوں نیچے سون میں جا کر پرانے بھاڑ جھونکیں۔ اتنے زمیندار پڑے ہیں کسی ڈیوڑھی تو ملی ہی جینے کے بیس چھلکوں میں سے ایک دو ہی بچ رہتے تو دوا دارو کے لئے اٹھا رکھ پر یہاں تو شیرو کی ایڑی میں کنکر اتر جائے تو ہسپتال کے سامنے گھنٹوں ٹیچر کے بیٹھنا پڑتا ہے ... پھر جب جا کر وہ حرام زادہ کمپونڈر ذرا سی ٹنچر لاتا ہے۔ حرام زادہ مجھے محتاج پا کر ہی تو آنکھ مار دی تھی پچھلے سال"۔

نفضلو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا؛ مریاں نے کمپونڈر کی یاد دلائی تو آپے سے باہر ہو گیا۔ لپک کر کونے میں سے کلہاڑا اُٹھایا اور بولا: "پچھلے سال بھی تم نے مجھے شیرے کا واسطہ دے کر روک دیا تھا مگر آج میں نہیں مانوں گا۔ ایسے سؤر کے بچوں کو جواب نہ دیا جائے تو آج آنکھ ماری ہے کل ہاتھ ڈال دیں گے ــــــ جانے دو مجھے ــــــ"

نفضلو کی گرج کے جواب میں مریاں مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے کلہاڑے والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، اور بولی: "میں بھی چپ تو نہیں رہی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ بابو، ذرا اپنی ماں کو بھی آنکھ ماری ہوتی۔ ذرا اپنی بہن کو بھی ٹٹول لیا ہوتا۔ حرام زادے، مجھے آنکھ مارتا ہے؛ مجھے، میں تو تجھ ایسے بیسیوں کو خرید کر قیا کر ڈالوں ــــــ میں بکتی جھکتی رہی اور وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا رہا اور کہتا رہا آہستہ بہن، ذرا آہستہ گالی دو۔ ڈاکٹر سن لے گا۔ مجھے تو ہنسی آگئی تھی اس پر!"

نفضلو نے کلہاڑا تو چھوڑ دیا۔ مگر کمپونڈر کو، پھر سب بنگلے کے چوکیدار کو اور مالی اور پھر بہشتو تک کو گالیاں دیتا رہا اور جب مریاں نے بہشتو کو گالی دینے پر اعتراض کیا تو اس نے مریاں کو بھی گالی دے دی۔ اور غصے میں بھرا ہوا باہر آگیا ــــــ اور باہر رئیس خانے کے صحن میں ڈاک بنگلے والا صاحب کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

"سلام!" نفضلو کا ہاتھ ایک دم ماتھے کی طرف اُٹھ گیا۔ اس کے تنے ہوئے ہوئے اعصاب میں اچانک سکون آگیا اور اپنے چہرے پر برسوں کی انکساری رتے ہوئے وہ صاحب کے پاس جا کر بولا: "کیا حکم ہے حضور!"

صاحب کی کنپٹیوں پر دو چار بال سفید ہو چلے تھے مگر چہرے کی رنگت میں سرخی غالب تھی۔ آنکھوں میں بھیگی بھیگی چمک تھی۔ اور ماتھے کے ابھار کے پیچھے چراغ سا جلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جوانی صاحب کے روپ میں پختہ ہو گئی ہے، پک چکی ہے، اور جیسے ابھی اس کے مساموں سے خون کے ننھے ننھے قطروں کی صورت میں

رسنے لگے گی۔ اس نے سگریٹ کو انگلی پر چڑھا کر فضلو کی کوٹھری کی طرف اس تیزی سے اچھالا کہ کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی مریاں اسے تیزی سے اپنی طرف آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ اور صاحب نے نہایت نرمی سے پوچھا "تمھارا ہی نام فضل دین ہے؟"

"جی" وہ صاحب کی گونجتی گونجتی آواز سے متاثر اور مرعوب ہو کر بولا۔

"مجھے ہی فضلو چوکیدار کہتے ہیں حضور"

"فضل دین یا فضلو چوکیدار؟" صاحب مسکرایا۔

"جی بس فضلو چوکیدار" وہ عاجزی سے بولا۔

"کنوارے ہو ابھی؟" صاحب نے پوچھا۔

"کنوارا؟" فضلو بڑے ادب سے ہنسا۔ "میں کنوارا کیسے ہو سکتا ہوں حضور میرا تو ایک بیٹا بھی ہے چار برس کا"

"اور بیوی؟"

"جی ہاں بیوی بھی ہے"

"اور ماں باپ بہن بھائی؟"

"وہ سب لد چکے حضور"

"افسوس ہے"

فضلو نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

صاحب کچھ دیر تک رئیس زمانے کی عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر پہلو میں لٹکتے ہوئے بیگ میں سے دوربین نکالی اور دور دور سوں کی وادی کی طرف دیکھنے لگا۔ دوربین کے زاویے کو بدلتے ہوئے جب صحن کے حاشیے کے درختوں سے ادھر فضلو کی کوٹھری کی طرف مڑا تو اچانک تیورا سا گیا۔ پھر دوربین کو تھیلے میں ڈالتے ہوئے ہنس کر بولا۔

"لاحول ولا قوۃ" ایسا لگا جیسے تمھارا گوارڑ میرے اوپر چڑھ دوڑا ہے"

اور کوارٹر کی کھڑکی میں مرتیاں اور شیرو فریم میں سجی ہوئی تصویر کی طرح کھڑے تھے۔ اور صاحب کے پھینکے ہوئے سگریٹ کا دھواں نیلی لہراتی دھاری بن کر ان کے چہروں پر سے گزر رہا تھا۔

"فضلو!"

"جی!"

اگر ہم ڈاک بنگلے سے یہاں تمھارے رئیس خانے میں اُٹھ آئیں تو کیسا رہے؟"

فضلو کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی اندر رہ گئی۔ اسے صاحب بھی اپنے سمیت سر کے بل کھڑا نظر آیا۔ رئیس خانہ بھی پھرکی کی طرح گھوم گیا۔ بڑی مشکل سے اس کے حواس ٹھکانے پر آئے اور وہ بولا، "میرے ایسے نصیب کہاں!"

"واہ!" صاحب بولا، "یہ بھی کوئی بات ہے اور مجھے تو یہ عمارت ڈاک بنگلے سے کہیں زیادہ پسند ہے، میں آج ہی یہاں اُٹھ آتا ہوں، اندر کچھ سامان ہے؟"

"جی سامان؟" وہ صابن دانی کی چوری کا راز صاحب کو بتا کر اسے رئیس خانے سے بدظن نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں کوئی پلنگ؟"

"جی، ہیں دو!"

"اور میز؟"

"جی ہے، اور دو کرسیاں بھی ہیں۔ ایک گلدان بھی ہے۔ ایک لالٹین ہے، غسل خانے کی بالٹی بھی ہے اور ـــــــ"

صاحب مسکرایا اور سگریٹ جلاتے ہوئے بولا: "اچھا تو میں ابھی آیا۔" کچھ دیر تک فضلو وہیں کھڑا رہا، جیسے اس کے پاؤں زمین میں دھنس کر رہ گئے ہیں پھر وہ دوڑ کر رئیس خانے کے برآمدے میں آ گیا، مگر وہاں سے اُلٹے پاؤں کوٹھری کی طرف بھاگا، کھڑکی

میں نے آدھا اندر کی طرف لٹک گیا۔ اور پکارا "مریاں" پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر اندر لپکا۔ مریاں دروازہ روکے کھڑی تھی۔ وہ بہت سنجیدہ تھی۔ اس کے ہونٹ سختی سے جڑے ہوئے تھے "تم اندر نہیں جا سکتے" وہ بڑے تحکمانہ انداز میں بولی۔

"اندر نہیں جا سکتا؟" فضلو نے ہانپتے ہوئے اور حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں؟" وہ اسی لہجے میں بولی "پہلے میں تمہاری گالی کا جواب دوں گی"

"گالی کا جواب دو گی؟" فضلو صاحب کی آمد کا مژدہ سنانے کے لئے اندر ہی اندر اُبل رہا تھا۔

"ہاں" مریاں بولی "تم نے مجھے گالی کیوں دی تھی؟"

فضلو ٹالتے ہوئے بولا: "بس دے دی کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" مریاں نے فضلو کا ہاتھ جکڑ لیا "یعنی کچھ ہوا ہی نہیں!"

"میں نے آج تک کسی کی گالی نہیں سہی۔ سنا؟" ——— اور وہ ایک وقفے کے بعد بولی

"سنا حرام زادے؟"

فضلو دم بخود رہ گیا۔ اور پھر ایک دم زور زور سے ہنستا ہوا مریاں سے لپٹ گیا۔ اسے اٹھا کر اندر کھاٹ پر پھینک دیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا "تو مجھے اونٹ کی بچی معلوم ہوتی ہے، ایسا بلا کا کینہ ہے تجھ میں"

"تو ہو گا اونٹ کا بچہ" مریاں نے جواب دیا، مگر ناگواری سے نہیں۔ اب وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ تہمد کے اُلٹے ہوئے پلّو سے اپنی پنڈلی ڈھانک رہی تھی۔ پھر وہ دونوں اور زور سے ہنسنے لگے۔ اور ان قہقہوں کے درمیان فضلو یوں اچانک اُٹھ کھڑا ہوا جیسے اُسے بھڑ نے کاٹ لیا ہے "مریاں سنو صاحب رئیس خانے میں آ رہا ہے"

مریاں کے قہقہے بھی رُک گئے۔

"صاحب ہمارے یہاں آ رہا ہے۔ سنتی ہو؟"

مریاں حواس باختہ سی نظر آ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد بولی۔" سچ ؟"

"ہاں ہاں۔ اللہ کی قسم، تمھاری قسم، وہ اپنا سامان لینے گیا ہے۔"

مریاں اداس ہو گئی۔" پر فضلو، وہ حرام زادے شکاری چھوکرے ہماری صابن دانی تک اُٹھا لے گئے، یہاں دھرا ہی کیا ہے، اُلو بول رہے ہیں دونوں کمروں میں یہ صاحب رئیس خانے میں ادھر آئے گا۔ ادھر بھاگ نکلے گا۔ میں تو کہتی ہوں اب یہاں جن بھی بسنے لگے ہیں۔ اس رات کو غسل خانے میں بالٹی بج رہی تھی۔"

لیکن فضلو نے اس وقت مریاں کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ چند روز ہوئے اس نے بالٹی میں سے ایک مری ہوئی چوہیا نکال کر باہر پھینکی تھی۔ اس نے مریاں کو سمجھایا کہ صاحب کو بس ایک پلنگ چاہیے۔ اور بس، —— پھر وہ رئیس خانے کا سارا سامان ڈھو کر برآمدے میں لے گئے۔ کمرے جھاڑے، پلنگ رکھے، کپڑے ٹانگنے والی کیلوں پر سے مکڑی کے جالے اتارے اور گلدان دھویا جا چکا تو مریاں ڈاک بنگلے کے مالی کی بہن بہشتو کے ہاں تازہ پھول مانگنے چلی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ مالی اور انجینئروں کے بنگلے کا چوکیدار سامان اُٹھائے آ رہے ہیں۔ کچھ فاصلے پر صاحب بھی سگریٹ پیتا آ رہا تھا لیکن اس کی نظریں نیچے پگڈنڈی پر بھی تھیں۔ اور مریاں اس کے قریب سے گزری تو جب بھی اس نے اوپر نہ دیکھا۔ پھر جب مریاں پھول لے کر آئی تو وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اور فضلو صحن میں چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ مریاں نے کوٹھری میں جا کر کھڑکی میں سے فضلو کو پکارا اور پھول اس کے حوالے کیے۔ فضلو نے اندر رئیس خانے میں جا کر انھیں گلدان میں سجایا باہر آیا اور گلدان صاحب کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ صاحب چونکا۔" کون لایا ہے یہ پھول"؟

فضلو بولا۔" جی بیوی لائی ہے۔"

" ڈاک بنگلے کے معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہیں تو ڈاک بنگلے کے وہیں سے مانگ لائی ہے۔"

"پھر وہی منحوس ڈاک بنگلے کے پھول۔" صاحب نے کتاب کا ورق اُلٹتے ہوئے کہا۔
"آج تو خیر مریاں پھول لے آئی ہے۔ لیکن کل سے پھول نہیں پتے سجادیا کرو۔ یہی رئیس خانے کے درختوں کے پتے، سمجھے؟"

فضلو حیران ہورہا تھا کہ آخر صاحب کو اس کی بیوی کا نام کیسے معلوم ہوا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ صاحب بولا: "تمھاری بیوی کا نام مجھے مالی کی بہن نے بتایا تھا۔ ابھی ابھی۔ مریاں ہی ہے نا؟"

"جی مریاں ہی ہے۔" فضلو نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مریم ہوگا۔ تم لوگوں نے مریاں بنالیا۔"

"مریاں ہی تھا صاحب۔"

صاحب کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کتاب ٹھپ سے بند کرکے بولا، "میری مرحوم بیوی کا نام مریم تھا۔"

فضلو کو خاموش اور متاسف پاکر بولا: "بجلی کا پنکھا بند کررہی تھی کہ کسی تار وار کو ہاتھ چھو گیا اور وہیں ختم ہوگئی ——— شکر ہے یہاں سکیسر پر ابھی بجلی نہیں آئی۔"

"جی شکر ہے۔" فضلو نے کچھ سمجھے بغیر صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی، اور صاحب پھر سے کتاب کھول کر ورق اُلٹنے لگا۔

چار روز تک پلاؤ اور مرغ پکاتے پکاتے مریاں کی بری حالت ہوگئی۔ جب دیکھو چولھے کے سامنے بیٹھی ہے۔ چولے کی آستینیں شانوں تک چڑھا رکھی ہیں۔ چہرہ سُرخ ہورہا ہے، بال بکھر رہے ہیں اور ان پر راکھ کے ذرّے جم رہے ہیں۔ ہاتھ سنے ہوئے ہیں، شیرا رو رہا ہے، فضلو بہلا رہا ہے، لیکن جب رات کو سب کاموں سے فرصت پاکر وہ کھاٹوں پر آتے تو ان کے پیٹ بھرے ہوتے اور دلوں میں سکون ہوتا۔ شیرے کو دو

دن بدہضمی کی شکایت رہی لیکن اب وہ مرغن غذا کا عادی ہو گیا تھا۔ صاحب نے اسے ایک نرم اور گرم مفلر بھی دیا تھا جسے وہ رات کو بھی گلے میں لپیٹے رکھتا اور جب وہ گہری نیند سو جاتا تو فضلو دھیرے سے اس کا مفلر کھینچتے ہوئے کہتا "ہمیں بھی تو جھو لینے دے سور کے بچے ———" دونوں خوب خوب ہنستے، صاحب کی ذرا ذرا سی حرکتوں کو بڑے احترام سے یاد کرتے۔ اور مریاں بارش کی دعائیں مانگتی، کیونکہ صاحب بارش کے لئے بہت اداس تھا۔ ہر وقت آسمان کی طرف دیکھتا رہتا۔ اور جب نیچے وادی میں بادل گرجتے اور نمی سے لدے ہوئے جھونکے رئیس خانے کے درختوں سے لپٹتے ہوئے آتے اور اس کی کتاب کے ورق الٹ دیتے، گلدان میں سجے ہوئے پتوں کو ادھر ادھر بکھیر دیتے اور اس کے بالوں کو ماتھے پر گرا دیتے تو وہ بڑے دکھ سے کہتا "فضلو ——— بھئی یہاں آس پاس کوئی پیر ویر ہو تو بارش کی تعویذ لکھوا لاؤ، یہ بھی کیا ساون ہوا کہ سمن کی ندیوں کی گونج رات کو یہاں سنائی دے جاتی ہے اور سکیسر لٹے ہوئے رنڈوے کی طرح بے بس کھڑا ہے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ بادلوں کی ساری فوج یہیں سے گزرتی ہے۔ پچھلے سال تو پھوار کسی وقت تھمنے ہی میں نہیں آتی تھی، مگر وہ ساون بڑا بے لطف تھا۔ ڈاک بنگلے میں مینہہ کا کیا مزا! چھت پر بوندوں کے گرنے تک کی آواز نہیں۔ کھڑکیوں پر لحافوں جیسے پردے لٹک رہے ہیں، ڈاک بنگلے میں رہنا یا کسی غار میں پڑا رہنا برابر ہے۔ بھئی فضلو تم تو عرصے سے یہاں ہو۔ اب کے ساون یہاں کب آئے گا؟" ——— اور وہ دوربین لگا کر نیچے وادی میں جھانکنے لگا۔

وہ فضلو سے اتنا گھل مل گیا تھا کہ اسے اپنے گھر کی ساری باتیں بتا دی تھیں۔ اس کی مرحوم بیوی کا نام مریم اور اس کا نام یوسف تھا۔ مریم مر چکی تھی۔ شادی کو ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ مریم کو بجلی کھا گئی اور وہ گھبرا کر خواہ مخواہ لمبے لمبے سفر کرنے لگا۔ مریم ساون میں مری تھی اس وقت اس کی کوٹھی کی چھت پر بوندیں گا رہی تھیں اور روشن دانوں کے شیشوں میں سے بجلی کے فوارے اندر

اندر لپک لپک کر مریم کی نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کو چندھیا جاتے تھے۔ دیرست جلی کا پنکھا چل رہا تھا۔ مگر ساون کی جھڑی نے خنکی پیدا کر دی تھی۔ اس لئے یوسف نے مریم سے پنکھا بند کرنے کو کہا اور یوں اپنی نئی نئی بستی ہوئی دُنیا اُجاڑ بیٹھا۔ وہ رات بھر مریم کی لاش سے چمٹا رہا۔ اور جب دوسرے روز رشتہ دار میّت کو قبرستان لے جانے لگے۔ تو وہ نینی تال چلا گیا۔ وہاں سے رنگون پہنچا۔ رنگون سے مدراس اور بمبئی کا چکر لگاتا۔ کراچی اور کوئٹہ آیا۔ اور چند روز وہاں کے جلے ہوئے پہاڑوں میں گھوم کر وہاں سے اپنے وطن۔ حُسن اور محبت کی اسی سرزمین پنجاب میں وارد ہوا۔ اور مری جانے کے بجائے سکیسر آنکلا۔ اور سکیسر کے ڈاک بنگلے کے باغیچے میں کھڑے ہو کر اس نے پہلے روز مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے دوربین لگائی تو کچھ ایسا متاثر ہوا کہ اب کے بھی یہیں آنکلا۔

"سکیسر پنجاب کا دل ہے"۔ یوسف نے کہا۔

فضلو نے چار دنوں میں پہلی بار یوسف سے اختلاف کیا۔ "نہیں صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ پنجاب کا دل تو لاہور ہے! اسے پنجاب کا دل نہ کہئے۔ یہاں پتھروں اور جھاڑ جھنکار کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے۔ ایک وہ جھیل ہے سو بھادوں کی دوپہروں میں ایسی گندی باس اُڑاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دنوں کا مرا ہوا گدھا پڑا سڑ رہا ہے اور پھر یہاں کے لوگ توبہ کیجئے حضور! کسی سے ذرا سی ان بن ہوئی تو نہیں کہ گھونسے طمانچے سے غصہ نکال لیا۔ بات بات پر برچھے پسلیوں کو کاٹتے ہوئے نکل رہے ہیں۔ اور تبر کلہاڑیاں گردن کی نسیں کاٹتی ہوئی جا رہی ہیں۔ توبہ کیجئے صاحب!"

لیکن صاحب کو اصرار تھا کہ پنجاب کا کوئی اور حصہ پنجاب کا دل کہلانے کا حق دار نہیں۔ دوسرے روز ہی بحث چھیڑتے ہوئے اس نے فضلو سے کہا: "سکیسر کی خوشگوار ہوا اور وادی کے منظروں کو تو رکھ دو ایک طرف، مجھے یہ بتاؤ فضلو کہ یہاں کی عورتوں کی خوب صورتی کا پنجاب بھر میں کہیں جواب مل سکے گا تمھیں؟ گھوم آؤ پنڈی ملتان اور

یا نوالی سے دلّی تک، مجال ہے جو تمھیں ایسی کافر آنکھیں، ایسی گھنی اور لمبی پلکیں، ایسے قد اور ایسے جسم، ایسا رنگ، اور ایسی چال مل جائے۔ میرے خیال میں یونان کے بادشاہ سکندر نے جب پنجاب پر حملہ کیا تو اس وادی میں اس کی فوج کا کوئی دستہ ہمیشہ کے لئے رُک گیا۔ ورنہ یہاں سَو میں سے پچانوے چہروں کا کٹ یونانی دیوی دیوتاؤں سا کیوں ہے۔ میں تو جسے بھی دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہومر پڑھ رہا ہوں۔ عورتیں ہیں، وینس ہیں، مرد ہیں کہ اپالو ہیں۔ ایسے تیکھے نقش تو انگرڈ برگمین کو بھی نصیب نہیں ہوئے۔ ایسی پامال کر دینے والی خوبصورتی تو ویلینٹینو کو بھی نہیں ملی تھی۔"

فضلو اس وقت، کچھ ایسے منہ کھولے بیٹھا تھا جیسے اس کا جبڑا پیدائشی کھلا ہو اور اب تک جڑنے نہیں پایا۔ اس کی پتلیوں تک میں کوئی حرکت نہیں تھی اور وہ یوسف کے ہونٹوں پر نظریں جمائے بُت بنا بیٹھا تھا۔ یوسف کے خاموش ہونے کے کافی دیر بعد تک وہ یوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر جب یوسف نے اُسے پکارا تو وہ جیسے نیند سے چونکا: "جی" اُس کے سارے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔ "جی"۔ وہ بولا، "جی ہاں۔ آپ سچ کہہ رہے تھے۔ خوبصورتی تو یہاں بَلا کی ہے۔ ایسی ایسی بیٹی پیدا کی ہے یہاں کی ماں نے کہ سبحان اللہ! آپ نے ٹھیک کہا۔ اگر آپ خوبصورتی کو لیتے ہیں تو یہ سچ مچ ہے پنجاب کا دل۔"

یوسف نے سگریٹ جلایا۔ بجلی اچانک نہایت زور سے چمکی اور بادل اس شدت سے کڑکا کہ پہاڑیاں دیر تک تانبے کی تھالیوں کی طرح بجتی رہیں۔ یوسف بھاگ کر باہر برآمدے میں آگیا۔ پھر فوراً اندر لپکا، ایک دم بادل جیسے پھوٹ پڑا۔ صحن میں تھوڑی سی دھول اُڑی اور بیٹھ گئی، پرنالوں کے دہانے سے پتے اور تنکے بوکھلا کر باہر آگرے اور ایک آن میں سکیسر پر جوانی آگئی۔ یوسف ابھی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سمیٹنے نہیں پایا تھا کہ فضلو کی کوٹھری کی کھڑکی میں سے مریاں چلائی:

"اے فضلو' ابے لپک کے آ، سب کچھ بھیگ گیا باہر چولہے کے پاس"۔ فضلو تہمد کو گھٹنوں تک اٹھا کر باہر بھاگنے کو تھا کہ یوسف نے کہا "یہ مریاں تھی شاید"۔

"جی مریاں ہی تھی"۔ اس نے جواب دیا۔

"آج پہلی بار اس کی آواز سنی ہے' شاید پردا کرتی ہے"۔ یوسف یوں ہی رواداری میں بولا۔

فضلو نے تہمد کو پھر گھٹنوں تک اٹھاتے ہوئے کہا "جی پردہ تو نہیں کرتی بس کھڑکی سے آواز آئی، کان کتے تو نہیں لے گئے ر"۔

فضلو نے گھبرا کر یوسف کی طرف دیکھا "گالیاں بکنے لگی سور کی بچی"۔ جاؤ بھاگو۔ یوسف نے ہنستے ہوئے کہا "کہیں مجھ پر بھی نہ برس پڑے"۔

اور فضلو جو صحن میں پہنچ چکا تھا ——— موسلا دھار بارش سے بے پروا ہو رک گیا اور پلٹ کر بولا "مجال ہے اس کی' زبان کاٹ کر انگاروں پر نہ رکھ دوں" اور لپک کر کوٹھری میں گھس گیا۔

پھر جب وہ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو صاحب کرسی پر بیٹھا ٹانگیں میز رکھے نیچے لٹکے ہوئے ہاتھ میں بے کار جلتا ہوا سگریٹ پکڑے گنگنا رہا تھا۔

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھری ہے جو اترتی چلی جائے

اس روز کوٹھری سے رئیس خانے تک کھانا لانے میں صاحب کی برساتی بڑا کام دیا۔ فضلو اور مریاں اُسے اپنے سروں پر تان لیتے اور پھر دونوں طشت تھا ہولے ہولے رئیس خانے میں آتے، مریاں برآمدے میں رک جاتی، فضلو طشت اند جاتا' باہر آ کر وہ پھر سے برساتی کو سروں پر تان کر کوٹھری سے کھانے کی دو قسط لینے جاتے۔ ایک بار جب مریاں برآمدے کے ایک ستون کا سہارا لیے

پر سے پانی جھٹک رہی تھی۔ تو اندر سے آواز آئی ” باہر کون ہے ؟“

”مریاں ہے صاحب!“ فضلو بولا۔

” باہر کھڑی کیا کر رہی ہے ؟“ یوسف کی آواز آئی ” ٹھنڈ ہو رہی ہے اس سے کہو اندر آجائے یا کوٹھری میں چلی جائے۔“

”جی کوٹھری میں چلی جائے گی“۔ فضلو نے کہا۔

لمحے بھر کے وقفے کے بعد یوسف بولا ” بہت اچھا کھانا پکاتی ہے تمھاری بیوی“۔

فضلو نے فوراً کہا ” جی وہ کیا پکاتی ہے گھی کے کھیل ہیں سارے“۔

اور مریاں باہر ہی سے بولی ” تیرے باپ کے کھیل ہیں“۔ اس کی آواز بلند ہو گئی۔ ”ذرا کسی روز صبح سے شام تک چولھے کے پاس بیٹھ تو نانی یاد آجائے حرام زادے کو۔“ اور وہ بھیگتی ہوئی اپنی کوٹھری کی طرف چلی۔

یوسف کو اس زور کی ہنسی چھوٹی کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور چہرہ لال ہو گیا، اس نے حواس باختہ فضلو سے قہقہوں کے درمیان پوچھا ——

” مزاج کیسے ہیں تمھارے ؟“

فضلو دانت پیستا ہوا زیرِ لب بولا ” سوٗر کی بچی“۔

یوسف کو ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد فضلو کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولا ” کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا حضور!“

” تمھارا غصہ تو ٹھنڈا ہولے“۔ وہ بولا: ” کھانا تو پیٹ میں جا کر گرم ہو جائے گا۔ گھبراتے کیوں ہو فضلو، تمھیں اینٹ کا جواب اینٹ ہی سے ملا ہے پتھر سے نہیں ملا۔

فضلو کا غصہ شاید ابھی نہیں اترا تھا۔ ” اس سوٗر کی بچی سے تو یہ بھی دور نہیں حضور کہ سچ مچ پتھر اٹھا کر دے مارتی۔ گھروں میں میاں بیوی کی کبھی ٹھن ہی جاتی ہے۔ پر حضور کے سامنے بک دینے کی عادت بہت بُری ہے“۔

"لیکن حضور کو تو لطف آ گیا۔" یوسف نے کہا اور فضلو کی ندامت کسی حد تک دور ہو گئی۔

مینہ کچھ دیر کے لئے تھم کر پھر برسنے لگا اور پھلوار میں بدل گیا۔ یوسف نے دونوں طرف کی کھڑکیاں کھول دیں اور چھت، درختوں کے پتوں اور پتھروں اور چٹانوں پر پھوار کی گنگناہٹیں سننے لگا۔ فضلو سونے سے پہلے یوسف سے حسب معمول "کوئی اور کام" پوچھنے آیا تو یوسف نے کہا "ہاں ایک کام ہے تو سہی۔" فضلو ہاتھ باندھے انتظار میں کھڑا رہا۔ یوسف سگریٹ جلا کر تین چار کش لگانے کے بعد بولا "ادھر آؤ۔"

فضلو چند قدم آگے بڑھا۔

"اور آگے آؤ، یہاں بیٹھ جاؤ پلنگ پر۔" یوسف نے بستر کے ایک حصے کو تھپک کر کہا۔

"پلنگ پر حضور!" فضلو دم بخود رہ گیا۔ "پلنگ پر کیسے صاحب؟"

یوسف نے اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے اپنے پاس بٹھا کر بولا۔ "ایسے۔"

فضلو کچھ ایسے انداز سے بیٹھا جیسے نرم نرم گدے کے بجائے تپتے توے پر بیٹھا ہے۔

"حضور!" اس نے حیرت سے کہا اور یوسف کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

یوسف آج کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے کا آدھا حصہ روشن تھا۔ فضلو کو گمان سا ہوا کہ اس کی آنکھ بھیگ رہی ہے اور گال پر پانی کا ایک قطرہ چمک رہا ہے۔ باہر پھوار کی مسلسل گنگناہٹ سے فضا پُراسرار ہو رہی تھی۔ پھوار نے فضا میں خنکی کے علاوہ کاجل بھی گھول دیا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے دور کسی بنگلے کے دور روشندان ذرا سے روشن تھے۔ میز پر رکھے ہوئے گلدان میں درختوں کے پتے بے ترتیب ہو رہے تھے۔ لالٹین کی زبان ہر تیز جھونکے کے ساتھ چلو بھر دھواں اوپر اچھال دیتی تھی، قسم قسم کے پتنگوں کے ہجوم نے لالٹین کے شیشے پر ہلہ بول رکھا تھا۔ ایک پتنگوں میں ایک بھڑ بھی تھی جس کے پروں کی بھنبھناہٹ دوسرے پتنگوں پر چھائی ہوئی تھی۔ فضلو نے ایک

پھر یوسف کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ اب گال پر چمکتا ہوا قطرہ ٹھوڑی کی طرف بہہ آیا تھا اور آنکھ کے گوشے میں ایک نیا قطرہ ڈھلک جانے کو تیار کھڑا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو فضلو؟" یوسف نے پوچھا۔

فضلو نے جھجکتے ہوئے ہاتھ اٹھایا اور انگلی سے اس کے گال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بس اتنا کہہ سکا۔ "یہ حضور — یہ" اور اس نے انگلی کو مٹھی میں شامل کر کے ہاتھ کھینچ لیا۔

"یہ آنسو ہیں۔" یوسف فضلو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"آنسو بہانا میری عادت ہے، اسی لئے تو مجھے ساون کا انتظار تھا، مریم انہی دنوں مجھ سے چھنی تھی نا۔ اس لئے ساون کی راتیں میں نے ہمیشہ روتے روتے گزاری ہیں، رونا بزدلی نہیں، ایک آنسو بہانے کے لئے اتنا بہت سا لہو جلانا پڑتا ہے اور میں رات رات بھر روتا ہوں، میں بہت دکھی ہوں فضلو، میرے پاس روپیہ ہے جاگیریں ہیں، زمینیں ہیں کوٹھیاں ہیں، لیکن میں کتنا غریب ہوں، مریم کے بغیر کتنا غریب ہوں۔" اس نے ایک طرف سے رومال اٹھا کر آنکھیں پونچھیں اور فضلو کے پاس کھسک کر بولا۔ "میں تو ایسا لٹا ہوں فضلو کہ اب کبھی آباد نہیں ہو سکوں گا۔"

"کیوں نہیں آباد ہوں گے حضور — ضرور ہوں گے۔" فضلو نے کچھ بولنا اپنا فرض سمجھا۔

"مگر کیسے؟" یوسف نے پوچھا۔

فضلو خاموش رہا، وہ صرف تسلی دینا چاہتا تھا، اس کے پاس آبادی کی کوئی تجویز نہ تھی۔

"ویسے فضلو۔" یوسف نے بڑے راز بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر تم میری مدد کرو تو اس ٹھنٹھ میں کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں۔"

"میں حضور؟" فضلو پر حیرتوں کی تہیں جم رہی تھیں۔

ہاں تم ـــ تم اپنے آپ کو اتنا چھوٹا کیوں سمجھتے ہو، فضلو تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو۔ دُنیا کا کوئی انسان معمولی نہیں اور تم چاہو تو میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔ کر سکو گے ؟"

" کروں گا حضور!" اُس نے کہا، کر سکا تو ضرور کروں گا، پر میں کر ہی کیا سکتا ہوں!"

" پھر وہی بات! دیکھو فضلو! بات یہ ہے کہ میں یہاں رئیس خانے میں اکیلا پڑا راتیں گزار رہا ہوں، تو سچ کہتا ہوں اکیلے رہنا کوئی نعمت نہیں مجبوری ہے اور ـــــ

" تو حضور" فضلو کے ذہن ایک تجویز آئی " میں سو جایا کروں آپ کے کمرے میں "

" نہیں بھئی " یوسف ذرا سا مسکرایا " تم مجھے آباد کرنے کے لئے اپنی مریاں کو برباد کر دو گے، ایسی بات نہیں، بس تم مجھے یہ بتاؤ کہ ـــ خیر رہنے دو تم بُرا مان جاؤ گے "

" بُرا کیوں ماننے لگا صاحب۔ آپ حکم تو دیجیے "

" بات یہ ہے کہ تم میری مدد کر سکتے ہو، لیکن اس کے لئے تمھیں بہت دلیر بننا پڑے گا، دیکھو، کیا اس سکیسر پہ ـــ یا نیچے اس وادی میں ـــ وہ خاموش ہو گیا، اُٹھا اور ایک کھڑکی بند کر کے اور لالٹین کو ذرا سا دھیما کر کے پھر فضلو کے پاس آبیٹھا۔ فضلو ہمہ تن گوش بنا بیٹھا تھا۔

اور پھر یوسف تیزی سے بولنے لگا " دیکھو فضلو دوست! کیا اس سکیسر پہاڑ پر کوئی ایک بھی ایسی عورت نہیں ہو گی جو میری راتیں آباد کر سکے، کوئی ایسی لڑکی نہیں ہو گی جو مجھ سے ایک سو روپئے لے کر رات بھر میری زندگی کی جلی شاخ پر پھول بن کر مہکے اور صبح کو چلی جائے۔ کیا خدا کے ایک دکھی بندے کی دنیا کو چند گھڑیوں کے لئے آباد کر کے تمھارا دل خوش نہیں ہو گا۔ فضلو، تم گھبرا کیوں رہے ہو، تم تو ہانپ اور کانپ رہے ہو، میں تمھیں ہر رات کے دس روپے دوں گا۔ میں مفت خور نہیں ہوں۔ مجھ پر جوانی کا بھوت سوار ہوتا تو میں لاہور واپس جا کر ہیرا منڈی میں ڈیرے ڈال لیتا، لیکن مجھے کاغذی پھول نہیں چاہئیں۔ اسی لئے تو میں زنگون سے کوئٹہ تک بھٹکتا پھرا۔ مجھے سچ مچ ایک

ۃت چاہے۔ سچ مچ کی ایک عورت۔"

یوسف ایک لمحے کے لئے رُکا، فضلو یوں ہانپ رہا تھا جیسے کوئی بہت اونچا
ٰ طے کرکے آرہا ہے۔ یوسف کی خاموشی کے دوران میں اس کی سانسیں اور تیز ہوگئیں،
ےپوٹے اوپر اٹھ گئے، وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا "نہیں صاحب میں غریب
ں، کمینہ نہیں ہوں، مجھ سے ایسا نہیں ہوگا، میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔"

"فضلو" یوسف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اس کی آواز بچوں کی طرح بھرآگئی اور
نکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں بہہ نکلیں۔ "نہیں فضلو، تم میرے لئے ضرور ایسا کروگے،
را دل اتنی مدت سے ویران پڑا ہے، تم چاہو تو اسے آباد کر سکتے ہو اور یہ بڑا نیکی کا
م ہے، ایک پیاسے کتے پر ترس کھا کر اسے پانی پلا دینے سے لوگ جنت میں جگہ پاتے
ں تو ایک انسان کی بھوکی روح کو سیراب کرنے سے تمھیں کتنا ثواب ملے گا۔
ں کا اندازہ ــــــ"

فضلو اپنا ہاتھ چھڑا کر پرے ہٹ گیا اور کہیں رُکے بغیر دروازے میں سے نکلتے
ۓ بولا۔" نہیں صاحب، میں کسان کا بیٹا ہوں، کنجر نہیں ہوں۔"

فضلو نہایت غصّے میں برآمدہ اور صحن طے کرکے اپنی کوٹھری کے دروازے تک
یا تو اندر مٹی کے چراغ کی پیلی پیلی جناتی روشنی دیکھتے ہی اسے اپنی اور مریاں کی
ڑپ یاد آگئی۔ کھانا کھانے کے دوران میں بھی وہ اس سے نہیں بولی تھی۔ پھر جب
ہ صاحب سے رات کے لئے رخصت ہونے جارہا تھا تو اس نے دھم سے کھاٹ پر گر کر
ادر تان لی تھی اور پھر اب تک اس نے چراغ نہیں بجھایا تھا۔ فضلو دروازے پر یوں
ٹھٹھک گیا جیسے صاحب نے اسے ننگا کر دیا ہے۔ وہ سوچ تک نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص
جی اُس سے عورتوں کی دلالی کی خدمت بھی لے گا اور خاص طور سے یہ صاحب ــــ
وہ اندر آگیا، پگڑی اتارے اور چراغ بجھائے بغیر کھاٹ پر سیدھا لیٹ گیا، اد

.بھنگ چھت میں سے کہیں دور دیکھنے لگا۔ پھوار رک گئی تھی۔ ایک مینڈک کہیں قریب کے گڑھے میں ٹرّا رہا تھا، چراغ کی لَو کا دھواں برمے کی طرح چھت میں سیدھا گھسا جا رہا تھا، شیرو نیند میں بڑبڑایا "اتنا تھوڑا سا تو پلاؤ دیا ہے ماں ـــــ اور بھی دو نا ـــ وہ سی بوٹی دو نا" فضلو نے سر اٹھا کر شیرو کی طرف دیکھا، وہ پرانے کھیس میں کچھ ایسے سمٹا ہوا تھا جیسے اس سے زیادہ سمٹے گا تو پسلیاں توڑ بیٹھے گا۔ مریاں بھی گٹھری بنی پڑی تھی، خود اس کا بستر بھی یخ ہو رہا تھا، اچانک اسے سردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے چادر اوڑھ لی اور آنکھیں بند کر لیں، کہیں سے سردی کی ایک دھار اندر آ رہی تھی۔ دروازے کی جھریوں میں تو سردیوں ہی میں اس نے گارا ٹھوپ دیا تھا، تو پھر یہ سردی کھڑکی میں سے آ رہی ہو گی، وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس ہو گیا، اس کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا، اُسے بھیڑنے لگا تو اسے رئیس خانے کی کھڑکی نظر آ گئی، پہلے تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے گہرے پیلے رنگ کی ایک چادر رئیس خانے کی دیوار میں جڑ دی گئی ہے مگر پھر اسے چادر کے نچلے حاشیے پر کچھ گرنٹھ سی محسوس ہوئی ـــــ تو یہ صاحب کا سر تھا! ـــــ تو وہ ابھی تک اسی طرح بیٹھا تھا؟ ـــــ بیٹھا رہے ـــــ اس نے سوچا ـــــ دیکھتا رہے عورتوں کے خواب، اس نے کھڑکی کا پٹ دھک سے بند کر دیا۔ مریاں نے چونک کر چادر میں سے سر نکالا اور ایک لمحے کے بعد پھر چادر میں چھپ گئی۔

"جاگ رہی ہو؟" فضلو نے پوچھا، مگر وہ خاموش رہی اور کہیں اندر سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ خاموش رہے، سب خاموش رہیں، اور اس سناٹے میں وہ اپنے دماغ میں بھڑکتے ہوئے الاؤ کو بجھانے کے لئے ہاتھ پیر مارتا ہوا سو جائے۔ وہ پھر سے کھاٹ پر لیٹ گیا۔

"چراغ بجھا دو" چادر کے اندر سے مریاں کی آواز آئی۔

"بجھا دوں گا" اس نے ناگواری سے کہا "جاگ رہی ہو؟"

مریاں خاموش رہی۔
فضلو نے مریاں کو ایک زناٹے کی گالی دینا چاہی، مگر اس سے اس سناٹے
کے مجروح ہو جانے کا احتمال تھا جو اس وقت فضلو کے لئے ہوا کی طرح ضروری تھا۔
دیر تک اسے اپنے آپ سے شرم آتی رہی۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ رو دے۔
آنسو اس کی پتلیوں کے پیچھے مچل رہے تھے اور گلے میں کچھ اٹک سا گیا تھا اور سارا خون
دماغ میں جمع ہو رہا تھا۔ پھر اچانک کھولتے ہوئے خون میں کوئی چیز جھنجھنائی اور
فضلو نے تیزی سے کروٹ بدل لی، ایک اور جھنکار ہوئی اور وہ تڑپ کر دوسری
کروٹ پر آ گیا۔ یہ جھنکاریں اور چھناکے اب اس کی رگوں میں دوڑنے لگے۔ اس کے
ٹخنے تک بج رہے تھے، اس کے کانوں کی لویں تک تپ رہی تھیں۔ وہ اُٹھ بیٹھا، چراغ
بجھا دیا، اور پھر دیر تک وہیں کھڑا بجھتے ہوئے چراغ کی لَو کا بدبودار دھواں پیتا رہا۔
دروازہ کھول کر باہر جھانکا، کوئی بھیگا ہوا پرندہ چولھے کے پاس آ گرا، پھر اُڑا
اور دیوار پر کھلونے کی طرح جا بیٹھا۔ وہ شاید سو گیا تھا۔
ساری دنیا سو گئی تھی، صرف صاحب جاگ رہا تھا یا فضلو۔ صاحب کی جیب
میں روپے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے، فضلو کی جیب خالی اور آنکھوں میں جلن تھی
اور اندر شیرو مارے سردی کے اب بے چین ہو ہو کر کروٹیں بدل رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔
اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ چراغ جلایا۔ خالی صندوقوں کے اوپر پڑا ہوا
ایک لحاف اٹھا کر شیرو کو اُڑھا دیا۔ چراغ بجھایا اور پھر کھاٹ پر آ رہا۔
دیر تک اس نے سو جانے کی کوشش کی۔ آیت الکرسی تین بار کی بجائے سو بار
پڑھ ڈالی، اپنے بالوں کی ایک لٹ کو اتنی دیر تک مروڑتا رہا کہ بالوں کی جڑیں دُکھنے
لگیں۔ ٹھوڑی کے ایک طرف ننھے سے مہاسے کو ناخن سے اتنی دیر تک کھرچا کہ وہ زخم
بن گیا، اٹھ بیٹھا، اور دیوار کا سہارا لے لیا۔ پھر جب پیٹھ دکھنے لگی تو کھاٹ پر پیٹ کے بل

لیٹ گیا۔ پسلیوں میں جھریاں سی جھنے لگیں تو پھر اٹھ بیٹھا اور دماغ میں دھماکے کے ساتھ ایک چھناکا ہوا۔ دس روپیہ روز ـــــ بیس دنوں میں دو سو روپے ـــــ دس مہینوں کی تنخواہ ـــــ اور پھر سب سو رہے ہیں، سب سو جاتے ہیں اور اسے روپیہ چاہیے۔ عورتوں کو بھی روپیہ چاہیے۔ ماؤں باپوں کو بھی روپیہ چاہیے۔ مولوی حلیم نے دو لڑکیوں کو خراب کیا، پکڑا گیا، قید ہوا، چھوٹ کر آیا، لعنت ملامت ہوئی، اور پھر دُنیا بھول گئی اور وہ پھر سے مسجد کا امام ہو گیا۔ دنیا بھول جاتی ہے، دنیا سو جاتی ہے، چوکیدار تک سو جاتے ہیں اور اندھیرا اتنا گہرا ہے کہ لوگوں کو عورت تو کیا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے اور بھشتو کے کانوں میں سونے کے کانٹے ہیں اور سر پر آبی دوپٹہ ہے۔ اور مریاں کے کانوں کی لوؤں کے سوراخ اُداس ہیں اور اتنے لمبے لمبے بالوں پر ایسے موٹے کھدر کی چادر ہے اور لوہے کی چادر پر رگڑی جائے تو اُسے بھی گھسا کر کاغذ بنا دے ـــــ اور صاحب آدھی رات کو اسی طرح بیٹھا ہے۔ وہ رو رہا ہے۔ وہ مرد ہو کر عورت کی طرح رو رہا ہے، اس کی آواز میں للکار کی جگہ پکار ہے، وہ اتنا بڑا آدمی ہے، اتنا بڑا زمین دار ہے اور اتنا غریب ہے، اتنا محتاج ہے کہ ایک چوکیدار سے ایک عورت کی بھیک مانگ رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ اس بھیک کی قیمت بھی ادا کرے گا۔

"مریاں جاگ رہی ہو۔؟"

"کیا ہے؟" غصے سے بھری ہوئی مریاں کی آواز آئی۔

"ارے! تم جاگ رہی ہو؟" وہ یوں گھبرا کر بولا جیسے مریاں کے سامنے اچانک ننگا ہو گیا ہے۔

وہ دیر تک چت لیٹا رہا۔ اس کی سانسیں تک بے آواز تھیں، اسے اپنا باپ یاد آ گیا جس کے ایک ہاتھ میں بل کی ہتھی اور ایک میں تسبیح ہوتی تھی، اور جس کے بارے میں

مشہور تھا کہ جس روز اس کی کوئی نماز قضا ہوئی، اُسی روز قیامت آئے گی۔ اور وہ جیل میں مرا کیونکہ مہاجن نے قرضہ کی واپسی سے ناامید ہو کر نالش کر دی۔ اور وہ بخار کی حالت میں اندر بھیج دیا گیا اور مر گیا۔ فضلو کی انگلیوں کی پوروں میں چُل سی ہونے لگی، جیسے سرسریاں جلد کے اندر گھس کر پوروں کے دائروں میں گھوم رہی ہیں ـــــ روپیہ ہے تو عزّت ہے، نیک نامی ہے، صحت ہے۔ روپیہ نہیں تو اُجڑے ہوئے رئیس خانے کی چوکیداری ہے، اور مریاں کی گالیاں ہیں اور خیرو کی کراہیں ہیں۔ روپیہ نہ ہو تو آدمی خدا تک کی راہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مسجد میں تیل تک نہیں دے سکتا، جمعرات کو مولوی کے لئے ایک روٹی تک نہیں پکوا سکتا۔ سر جُھکا کے چلتا ہے۔ ہاتھ جوڑتا ہے، منّت کرتا ہے، مُنہ میں بھر آنے والا پانی تھوکتا ہے ـــــ اور پھر یہاں حوریں تو نہیں بستیں، عورتیں بستی ہیں، اور یہ عورتیں وہ پریاں نہیں کہ چھو لو تو طوطے بن جائیں، بہشتو ہی کو لو، اس کی آنکھوں میں ایسا باؤلا پن ہے جیسے زرا سا اشارہ کر دو تو بھاگ کر آئے گی اور گود میں بیٹھ جائے گی۔ مریاں جیسی عورتیں زرا کم ملتی ہیں یہاں، جو پردہ نہیں کرتیں، مگر پھر بھی ایسا پردہ کرتی ہیں کہ کوئی دیکھ لے تو خود ہی پانی پانی ہو جائے اور وہ سرائے کے بھٹیارے کی رانی، خوبصورت ایسی کہ لٹھے کے تھان کی مورت اور ندیدی ایسی کہ اٹھنّی دکھاؤ تو بھوکی کتیا کی طرح بھاگی آئے۔ اور پھر یہ مسافر عورتیں جو سروں پر پوٹلیاں رکھے، سڑک پر سے گزرتی ہیں اور یہ کنواریاں جن کی مدّت تک شادیاں نہیں ہو سکتیں، مارے غریبی کے، اور یہ بیاہی عورتیں جن کے شوہر ہانگ کانگ پولیس میں ہیں اور پانچ سال کے بعد ہی تین مہینے کے لئے گاؤں کا چکر لگا پاتے ہیں، جب کہ ان کی بیویاں گاؤں کی بوڑھی دایہ کو چار بار انعام دے چکی ہیں، لاحول ولا قوۃ، آدمی ایسا بزدل کبھی نہ ہو کر عورت کا نام سنا اور گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ ایک دم اُٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ رئیس خانے کی کھڑکی اسی طرح روشن تھی، اور صاحب کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ فضلو نے کھڑکی کو کھلا چھوڑ کر دروازہ کھولا اور تیزی سے صحن کو طے کر کے برآمدے میں گیا۔ دروازے پر جاتے ہی لوہے کی لاٹھ کی طرح جم گیا۔ زندگی کے سارے آثار اس کے وجود سے غائب سے ہو گئے اور اگر فوراً یوسف کی آواز اُسے نہ چونکا تی تو شاید قیامت تک وہ یوں ہی جا کھڑا رہتا۔

"رُک کیوں گئے فضلو"؟ یوسف بولا۔

اور فضلو کے پاؤں تلے جیسے ایک اسپرنگ نے اسے اچھال کر اندر پھینک دیا۔

"بیٹھو" یوسف نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

فضلو نے دروازے کی طرف دیکھا، پھر چھت پر ایک نظر یوں دوڑائی، جیسے وہاں بھی کوئی دروازہ کھلا ہے۔ پھر سامنے دیوار پر نظریں گاڑ دیں، اور ہاتھوں کو ملتے ہوئے رک رک کر بولا "جی میں کروں گا ــــ کل سے کروں گا"

اور اس کے بعد جیسے اسی اسپرنگ نے اسے اُچھال کر پھر سے دروازے پر پھینک دیا۔ مگر یوسف نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا، اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب میں سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اسے فضلو کی انگلیوں کی پوروں سے چھواتے ہوئے بولا "تم اتنے شریف، اتنے نیک اور اچھے آدمی ہو کہ میں تمہاری جھجک پر حیران ہو رہا تھا۔ یہ تمھارے وعدے کا انعام ہے"

فضلو کی پوروں کی جلن اب دُکھن میں بدل گئی تھی، اس نے نوٹ کو پوروں میں جکڑ لیا، اور اسی ہاتھ کو ماتھے تک لے جاتے ہوئے "سلام" کہا اور چلا گیا۔ کوٹھری کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا، لالٹین بجھ گئی تھی اور رئیس خانہ اس کی کوٹھری کی طرح اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ فضلو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کئی دنوں

کے بھوکے کو پیٹ بھر کھانا کھلایا ہے۔ وہ اندر کھاٹ پر لیٹ گیا، کچھ دیر اندھیرے میں آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ پھر نوٹ کو جیب سے نکال کر تکئے کے نیچے رکھا اور نہایت اطمینان سے سو گیا۔

صبح دیر تک سویا رہا۔ مریاں نے چائے تیار کرنے کے بعد اس کا شانہ ہلایا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے سامنے مریاں کو دیکھا، پھر باہر ننھی ننھی پھوار کی جھالر کے پار ٹین کی چھت تلے چولھے کے پاس شیرو کو بیٹھے دیکھا جو مٹی کے پیالے میں چائے کو پھونکیں مار رہا تھا اور پھر اس نے آسمان کے ایک ٹکڑے کو دیکھا۔ "ابھی تو سورج بھی نہیں اُبھرا۔" اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"سورج نہیں اُبھرا!" مریاں نے طنز کی۔ رات کا غصہ شاید ابھی تک باقی تھا۔ "سورج بادلوں بادلوں میں نہ جانے کہاں جا پہنچا ہے اور اس کے لئے ابھی پو بھی نہیں پھٹی۔ رات بھر کیا کرتے رہے ہو؟ چوہوں بلیوں کی طرح کبھی لحاف گھسیٹ رہے ہو، کبھی کھڑکی کے پٹ کھڑکا رہے ہو، کبھی دروازہ کھل رہا ہے، کبھی باہر کی سیریں ہو رہی ہیں —— بہت تو نہیں کھا گئے تھے؟"

فضلو کی نظریں اس وقت بند کھڑکی پر جمی تھیں۔ اسے آہستہ آہستہ یاد آ رہا تھا کہ اس نے کھڑکی کھول کر رئیس خانے کی طرف دیکھا تھا اور پھر کھڑکی بند کئے بغیر باہر چلا گیا تھا۔ "یہ کھڑکی کس نے بند کی؟" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں نے؟" مریاں بولی۔

"کب؟" اس نے پوچھنا چاہا مگر پوچھ نہ سکا۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں —— کوٹھری کے صاف ستھرے فرش میں اسے جا بجا گڑھے نظر آنے لگے، مریاں سے اسے خوف آنے لگا۔ "مریاں"۔ اس نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ تمھارے روٹھ جانے کی وجہ سے میں رات بھر اداس رہا۔ نیند نہیں آتی تھی۔"

"حرام زادہ" مریاں نے کہا، مگر اس انداز سے کہ فضلو نے اس گالی کا جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا۔"میں روٹھی تھی تو تم بھی روٹھے تھے، تم نہیں سوئے تو میری آنکھ کب لگی۔ ذرا ادھر دیکھو۔"

" تو وہ رات بھر جاگتی رہی ہے! ـــــ تو پھر اس کو سب کچھ معلوم ہے"!

" ادھر دیکھو" مریاں نے دوبارہ کہا۔

اس نے مریاں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سوج رہی تھیں اور تھکی ہوئی تھیں، لیکن ان میں غصہ یا غم نہیں تھا، پیار کی روشنی تھی۔"آنہ من جائیں" وہ بولی۔"دایاں ہاتھ ادھر لاؤ۔"

فضلو اطمینان سے مسکرایا، اپنا دایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مریاں چیخ اٹھی۔

"ارے، یہ تو دس روپے کا نوٹ ہے! اتنے بہت سے روپے کہاں سے لائے ہو تم؟ ـــــ تنخواہ تو ابھی پرسوں ہی ملی تھی۔"

" صاحب نے بخشیش دی" اس نے کہا۔"وہ ہماری خدمت سے بہت خوش ہے۔"

" بخشیش" مریاں جیسے نشے میں بولی۔" جیتا رہے، پھلے پھولے! خوشیاں دیکھے۔ اور فضلو آج بڑا غضب ہو گیا۔ صاحب کے لئے مکھن کہیں سے نہیں ملا۔ سب کہتے ہیں رات اچانک سردی پڑی اس لئے دہی نہیں جا۔ بلونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بڑی شرم آرہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمارا صاحب قلندر آدمی ہے اور سوّر کی بچی صلح بھی ہو چکا۔ اور ابھی تک پیار تک کی توفیق نہیں ہوئی، کچھ شرم ہو تو ڈوب مر و جائے کی کیتلی میں"

مریاں ہنس دی۔ اس نے بھی فضلو کی گالی کا جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا۔ وہ جھکی، اس کے ایک گال کو چوما اور پھر اپنا گال آگے کر دیا۔ فضلو نے پہلے تو اسے ہلکا سا طمانچہ مارا، پھر جب وہ سنجیدہ سی بن کر پلٹنے لگی تو فضلو نے اسے جکڑ لیا اور اتنے پیار کئے

کہ باہر شیرو چائے پینا تک بھول گیا۔

چائے کا طشت لے کر وہ رئیس خانے کو چلا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ بڑی مشکل سے سنبھلا اور اندر کچھ یوں جھینپتا جھینپتا گیا جیسے اپنے چہرے پر سے رات کی کالکھ دھونا بھول گیا ہے۔ لیکن یوسف نے رات کی کوئی بات نہ کی، خوشگوار موسم کا ذکر کیا اور اس سے کہا: "ذرا یہ دوربین لے کر سکیسر اور سون کے نظارے دیکھو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دنیا کی بڑی بڑی لینڈ اسکیپ پینٹنگز بکھیر دی گئی ہیں ہر طرف۔ بڑے اچھے نظارے ہیں"۔ فضلو دوربین لے کر باہر صحن میں آ گیا۔ نیچے وادی میں جھیل کے کنارے کے درختوں کے عکس دیکھتا رہا۔ پھر چٹا اور کوٹلی اوگالی کے دیہات پر سے ہوتا ہوا انگہ پہنچا، جہاں سفید سفید دو منزلہ مکان آسمان کے ابر آلود ہونے کے باوجود چمک رہے تھے۔ لمبائی میں بکھرا ہوا انگہ سے اتر کر وہ شکر کوٹ اور سرال پر آیا اور ان دیہات کے جنوب میں بکھرے ہوئے سبزہ زاروں میں جا بجا گھنے توتوں میں گھرے ہوئے کنوؤں اور ان کے گرد ترشی ہوئی کیاریوں کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا وہاں سے وہ سون کے مرکزی قصبہ نوشہرہ کی طرف گھوما، شہر سے زیادہ ہسپتال اور اسکول کی عمارتوں پر رکا، پھر تھانے پر آیا۔ کالی بھجنگ عمارت ایک پرانے قبرستان کے سرے پر شاید پرانی قبروں میں ہی اپنی بنیادیں گاڑے کھڑی تھی۔ پھر وہ سکھرال، کفری، اور کردڈھی پر سے ہوتا ہوا اچھالی پہنچا۔ یہ گاؤں جھیل کے جنوب مغربی کنارے پر آباد تھا۔ گاؤں کے ارد گرد کنوؤں کے پاس توتوں کے چھتنارے تلے بہت سے خیمے تنے ہوئے تھے، ان خیموں میں ایسے میدانی رئیس بستے تھے جو سکیسر کی بلندیوں پر آنا برداشت نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ سکیسر پر مرغی کا ایک انڈا چار آنے میں اور گلاب کا ایک پھول آٹھ آنے میں ملتا تھا۔ اور ڈاک بنگلے کے مالی کی غیر حاضری میں تو اس کی بن بلائی بہشتو نے کئی لوگوں سے ایک پھول کا ایک روپیہ تک وصول کیا تھا۔ فضلو فوراً پلٹا اور دوربین

کو سکیسر کے بنگلوں پر گھمایا، صحن سے ڈاک بنگلہ نہایت صاف نظر آتا تھا مگر دوربین کی دیہ سے وہ ابھی ڈاک بنگلے تک نہیں پہنچنے پایا تھا۔ درخت نہا کر نکھر گئے تھے۔ ننھی ننھی پھوار نے پتیوں پر موتی ٹانک دئے تھے اور ریس خانے کے درختوں کے پتے تو فضلو کو صاحب کے بٹوے کے برابر بڑے نظر آرہے تھے۔ پھر ایک دم گھومتی ہوئی دوربین ڈاک بنگلے پر جاکر رک گئی۔ باغیچے میں بہشتو پھول توڑ رہی تھی۔ وہ اسے اتنی قریب محسوس ہوئی کہ اس کا جی چاہا کہ اس سے بات کرلے۔ اس کا لباس علاقے کی دوسری عورتوں کی طرح ڈھیلا ڈھالا تھا، مگر پھوار کی وجہ سے وہ جگہ جگہ سے اس کے جسم سے چمٹ گیا تھا اور بھری بھری آپے سے باہر جوانی کے بڑے کافرادائے اور ظالم قوسیں نمایاں تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، شاید وہ کچھ گنگنا رہی تھی اور ایک درخت پر بیٹھے ہوئے لال چونچوں والے سبز توتے گردنیں یوں جھکائے بیٹھے تھے جیسے بہشتو کو دیکھ رہے ہیں اور دیکھ نہیں رہے تو سن ضرور رہے ہیں۔

"بھئی تم تو دوربین ہی کے ہو رہے" اندر سے آواز آئی اور وہ چونکا۔ چائے کے برتن واپس پہنچا کر اور خود جلدی جلدی چائے پی کر وہ باہر سڑک پر آگیا۔ روزانہ اس وقت باہر جانا اس کا معمول تھا۔ مرغیاں خریدتا تھا، انھیں ٹٹولتا تھا، انھیں ہاتھ پر تولتا تھا، ان کے دام چکاتا تھا اور پھر انھیں گھر لاکر اور ذبح کرکے ان کی چمڑی ادھیڑتا تھا' لیکن آج وہ کچھ اور خریدنے نکلا تھا۔ زندگی میں یہ اس کا پہلا تجربہ نہ سہی، پہلا عملی تجربہ ضرور تھا۔ شادی سے پہلے اس نے جی ہی جی میں گاؤں کی ہر خوش رو لڑکی سے عشق کیا، چوراہوں پر بیٹھا، الغوزے بجائے، ہیر گائی لیکن اس نے آج تک کسی لڑکی کا پلو نہیں کھینچا تھا، کسی کے کنکری نہیں ماری تھی، کسی کے قریب سے گذرتے ہوئے آہ نہیں بھری تھی، بس سب کو آنکھ بھر کر دیکھا تھا اور بہت دنوں تک سب کے لئے ترس ترس کر جیا تھا' اور پھر اسے مریاں مل گئی جسے دیکھ کر وہ ساری دُنیا

حُسن بھول گیا تھا، اسے تیلی کی اس لڑکی تنک کا حُسن بھول گیا تھا جس کے بارے
ں سوچتے سوچتے اس نے خوابوں میں اس کے کولھو چلائے تھے اور نمبردار کے گھر سے
رسوں اور تارا میرا کی بوریاں چوری چوری اس کے ہاں ڈھولایا تھا۔ مریاں سب سے
تلف تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں کے پپوٹوں پر کاجل کی دُھندلی سی لکیر آج پانچ چھ
سال سے بار بار دھوئے جانے کے باوجود نہیں دھلی تھی۔ اس کے چہرے کی لالی اور
لبوں کی شفق کو سوکھے ٹکڑے تک نہیں چھین سکے تھے اور اس کے بالوں کی لہریں
لڑائی کی بے رحم کنگھیوں میں سینکڑوں بار کسے جانے کے باوجود نہیں مٹنے پائی تھیں۔
مریاں کے بارے میں اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اگر وہ بات بات پر گالی نہ بکے
تو اس کی ٹکر کی عورت کسی نواب کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ وہ آج پانچ چھ برس
تک مریاں سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور آج وہ بہشتو کے پاس جا رہا تھا۔
ذرا اگر بہشتو نے اپنے بھائی سے کہہ دیا ——— اس کے بھائی نے کسی افسر سے کہہ دیا
——— اور پھر کسی نے اگر مریاں سے کہہ دیا ——— تو؟ تو کیا! بہشتو اسے تو تھپڑ
پا جیسی تھی اور ——— لیکن سامنے کھڑی ہوئی بہشتو کی آواز نے اس کے ڈولتے
ہوئے ارادے کو سنبھالا دیا۔ "کہاں چلے فضلو بھائی، مرغیوں کی تلاش میں ہو گے۔
یہ صاحب سکیسر پر مرغیوں کی نسل ختم کر کے ہی دم لے گا" ——— وہ زور سے ہنسی
اس ہنسی میں گھنٹی کی سی ٹنٹناہٹ تھی۔ ایسی ہنسی جو صحت مند خون کے کھلاؤ ہی
سے پیدا ہو سکتی ہے۔

"بھول جائیں" ہے اس نے پوچھا۔ "ارے حیران کیوں کھڑے ہو؟ میں نے کبھی
تم سے قیمت لی ہے جو آج لوں گی، مریاں اپنی سہیلی ہے۔"

ہیر پھیر سے بات کرنے کی ان گنت تجویزیں فضلو کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئیں۔
اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ہونٹ اچانک خشک ہو گئے، آنکھوں سے پتلیاں جیسے غائب

ہو گئیں اور وہ پاگلوں کی طرح نہایت بھونڈے طریقے سے بولا۔ "بشتو۔"

"کہو۔"

"رات صاحب کے پاس گزار دگی ؟ سو روپے ملیں گے۔" اور وہ خیال ہی خیال میں زمین کے اندر دھنسنے لگا ـــــــ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ سکیسر کی چوٹی پر کھڑا ہے یا جھیل کی تہہ میں بیٹھا ہے اور آسمان سے پھوار گر رہی ہے یا کنکریاں برس رہی ہیں۔

بشتو نے اس کے ہاتھ کو اس تیزی سے جکڑا کہ انگلیوں کی ٹیس نے اس کے سب حواس کو چوکنا کر دیا۔ وہ سرگوشی میں بولی: "کس وقت ؟"

ارے!

فضلو جھیل کی تہہ سے اٹھ کر ڈاک بنگلے کے باغیچے میں آ گیا۔

"عشا کی نماز کے بعد وہ بولا۔" وہ بولا۔

"کہاں ملو گے ؟"

"سڑک سے ادھر پرانے کھو کے نیچے۔"

"سو ہی ملیں گے نا۔"

"ہاں ہاں پورے سو۔"

"بھیا کو خبر نہ ہو۔"

"مجھے کیا پڑی ہے ؟"

"آہستہ بولو۔"

"تم بھی ذرا آہستہ بولو۔"

کچھ دیر رک کر وہ مسکرائی اور بولی۔ "صاحب آج پانچ چھ دن سے تمہارے یہاں ہے۔"

"ہاں۔"

"مریاں نے کتنے سوکھلائے ہیں؟"

ایک دم جیسے آسمان ٹوٹ پڑا اور سکیسر بیٹھ گیا "سور کی بچی" اس نے بہشتو
ل دی اور مٹھیاں بھینچ کر اور نچلے ہونٹ کا ایک حصہ دانتوں تلے دبا کر بھاگا۔
"فضلو بھائی" بہشتو کی آواز آئی۔

مگر وہ بھاگا چلا گیا۔ رئیس خانے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی رفتار اور تیز
، اور پھر بہت نیچے سڑک کے بڑے موڑ پر چیٹے ہوئے بادلوں میں اتر گیا۔ وہ کافی
ے بعد واپس آیا۔ نہایت گنجان بوندیں گر رہی تھیں اور تیز ہوا نے اچھی خ
کر دی تھی نیچے وادی کا ایک حصہ دھوپ کی وجہ سے سنہری ہو رہا تھا مگر سورج
ہیں نشان نہ تھا۔ فضلو ٹھٹھرا اور بھیگا ہوا کوٹھری میں آیا، صاحب کو کھانا کھلانے
مد پھر کوٹھری میں آ گھسا اور کھاٹ پر لیٹ رہا۔ مریاں وقت سے پہلے اس کے لئے
بنا لائی "آج تم کچھ سست سے لگ رہے ہو، موسم ایک دم بدلا ہے نا۔
ر اوڑھ کر باہر جایا کرو، سکیسر کا ساون تو سرن کے اسوج کے برابر ہوتا ہے،
بائے پیو، اٹھو"

وہ چپ چاپ چائے پینے لگا۔ پھر چادر اوڑھ کر صاحب کو چائے پلانے گیا
واپس آ کر کھاٹ پر پڑا رہا۔ صاحب کو کھانا کھلانے گیا اور پھر واپس آ کر کھاٹ
پڑا۔ اس نے صاحب سے کوئی بات نہ کی اور صاحب نے بھی اس کی سنجیدگی کو نہ توڑا۔
نے سے معلوم تھا کہ اس سنجیدگی کی تہہ میں کچھ ہے۔ سکیسر کی مسجد میں عشا کی نماز
ھ کر جب نمازی باتیں کرتے ہوئے رئیس خانے کے قریب سڑک پر سے گزرے تو فضلو
نکا مگر چادر منہ تک چھپا لیا۔ اندر اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور کھدر کی چادر میں سے
ے چراغ کی روشنی بہت ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی۔ ماں اور خیرو آج اطمینان سے
د رہے تھے۔ مریاں نے دیر تک اس کا سر دبایا تھا۔ اور پھر اس کی کھاٹ پر سے یوں دبے پاؤں

اُتری تھی، جیسے وہ سو گیا ہے۔ مریاں پر اُسے بہت پیار آنے لگا۔ پھر اچانک اُس جی میں آئی وہ کوٹھری سے نکل کر سیدھا ڈاک بنگلے میں پہنچے اور وہاں باغیچے میں ہو کر بہشتو کو ایسی ایسی گالیاں دے جو آج تک کسی نے نہ سُنیں نہ سوچیں۔ وہ چاد چُپکے سے باہر آ گیا۔

رئیس خانے کی کھڑکی روشن تھی، روشنی سے کترا کر سڑک کی طرف جانے لگا کھوکھے تنے کے پاس کچھ ہلا اور آواز آئی "فضلو بھائی"!

وہ گڑ گیا، اس کے دماغ میں پٹاخے چھوٹنے لگے۔ گالیاں اس کے دماغ سے اس کے گلے میں ایک دوسرے پر سوار ہو کر بیٹھ گئیں اور اس کی زبان کی نوک تپ گئی بہشتو اس کے قریب آ گئی، "میں تو بھیگ گئی فضلو! اتنی دیر سے تو بیٹھی ہوں۔ تو کب کی ہو چکی"!

فضلو وہیں جما رہا۔

"اور فضلو، مجھے بخش دو، مجھے کیا خبر تھی کہ میرے ذرا سے مذاق پر تمہیں اتنا آ جائے گا۔ میں تو صرف مذاق کر رہی تھی۔ اور ــــــ"

فضلو نے اس کا ٹھنڈا اور بھیگا ہوا ہاتھ پکڑا اور چپ چاپ رئیس خانے چلا۔ برآمدے میں قدم رکھنے سے پہلے اس نے پلٹ کر کوٹھری کی کھڑکی کی طرف دیکھا، ا جھری نظر آ رہی تھی۔ وہ چراغ بجھانا بھول گیا تھا، اور یہ جھری جیسے اس پر ہنس ر تھی۔ پھر وہ ایک تیز جھری بن گئی، پھر سمٹ کر مریاں کی نتھنے اور دُکھ سے بھری ہوئی آ بن گئی اور جب فضلو نے اپنی آنکھیں ملیں تو وہ پھر سے جھری بن گئی اس نے بہشتو کو سے گھسیٹ کر تیزی سے اندر جانا چاہا، مگر بہشتو اپنا ہاتھ کھینچ کر آہستہ سے بولی "پو سو ہی ملیں گے نا؟"

"پورے سو" فضلو پہلی بار بولا۔ اندر سے اندر لے گیا۔

یوسف گھٹنوں کے اردگرد باہیں لپیٹے، سر کو گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا، آواز
کر چونکا۔ اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اس کے چہرے پر اور اُسس کی
ہوں تک میں پھیل گئی۔ وہ تیزی سے اٹھا، کھڑکی بند کر دی، فضلو کو باہر برآمدے میں
اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر بولا "تم بہت اچھے آدمی ہو فضلو، میں جیتے جی تو تمھارے
ن کا بدلہ شاید ہی اتار سکوں، یہ لو ایک سو کا نوٹ یہ بہشتو کے لئے اور دس روپیہ
——— یہ تمھارے ہیں۔ کل نیا حساب چلے گا ——— میں بُرا آدمی نہیں ہوں فضلو۔
نیا بُری ہے، یہ ساون بُرا ہے ——— سمجھے ——— ؟ خدا حافظ!"

فضلو کی پوروں میں صبح والی چُل جاگ اٹھی، اس نے دونوں نوٹ اپنی مٹھی میں
بائے اور اپنی کوٹھری میں آ گیا۔

وہ ساری رات جاگتا رہا، دیا بجھانے کے باوجود اسے نیند نہ آئی، مریاں کی سانسوں تک کی آواز
ے وحشت ہو رہی تھی۔ شیرو سک کھٹولے کی ایک ذرا سی آواز سے وہ لرز اٹھتا تھا۔ اس کی آنکھیں دُکھنے لگیں،
بان جڑ تک خشک ہو گئی، سانس تک مشکل سے آنے لگی، ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا، صبح قریب تھی۔ وہ رئیس خانے کی طرف
نکلا اندر لالٹین جل رہی تھی اور یوسف سو رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں گیا وہاں ٹمٹما
جل رہا تھا اور بہشتو پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ فضلو کے اندر جاتے ہی وہ بھڑک کر
اُٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ بولی "یہ کیسا صاحب ہے فضلو، یہ تو کچھ انوکھا صاحب
میں نے تو یہ رات کانٹوں پر گزاری ہے، ایسا لگتا تھا جیسے ہاتھ پیر کاٹ کر گھوڑے
ڈال دی گئی ہوں۔ سو روپے کا سودا اور ہوا یہ کہ تمھارے جانے کے بعد اس نے بڑے
پیار سے میرے لئے یہ بستر بنایا، پھر مجھے یہاں بیٹھ جانے کو کہا۔ لالٹین وہ سامنے رکھ دی
اور مجھے پاگلوں کی طرح ٹکر ٹکر بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے گھبرا کر رخ بدلنا چاہا
بولا: "نہیں یونہی بیٹھی رہو۔ میں تمھیں دیکھوں گا۔ میں صرف دیکھوں گا تمھیں۔

تمھیں نیند آئے تو سو جانا، میں تمھیں سوتا دیکھوں گا۔ تم رونا چاہو تو رو دینا میں تمھاری بھیگی آنکھیں دیکھوں گا۔ بس میں تو صرف دیکھوں گا تمھیں، اور فضلو وہ مجھے اسی طرح دیکھتا رہا۔ میں کر لیٹ گئی جب بھی وہ مجھے دیکھتا رہا۔ میری ذرا سی آنکھ لگ گئی۔ پھر جب کھلی تو وہ اسی طرح میرا دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے نیند نہیں آئی، بس آنکھیں بند کیے پڑی رہی اور وہ سامنے اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر جب پہلے مرغ کی بانگ سنائی دی تو لالٹین اُٹھا ادھر کمرے میں چلا گیا اور میں جب سے نہیں سو پائی، جانتی تھی کہ ابھی صبح ہو جائے میرا تو جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے گھٹنوں تلے دبا کر خوب خ پیٹا ہے، اور اس نے مجھے چھوا تک نہیں فضلو۔"

فضلو کی حیرانی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ صاحب اس کی نظروں میں اچانک ولیوں کی صورت اختیار کر گیا جو لڑکوں لڑکیوں سے محبت کر کے خدا کی محبت تک پہ گاؤں کا مولوی حلیم بھی اسے بالکل بے گناہ نظر آنے لگا۔ ممکن ہے وہ بھی خدا پہنچنے کی کوئی سبیل ڈھونڈ رہا ہو۔

۔۔۔ اور یہ صاحب ۔۔۔ !

اس نے سَو کا نوٹ بہشتو کے زانو پر رکھ دیا۔

" سَو کا ہے نا؟" اس نے دیے کی طرف جھک کر نوٹ کو اُلٹا پلٹا۔

" پورے سو کا ہے۔" وہ بولا۔ " جاؤ، پو پھٹنے ہی والی ہے۔"

" تمھارا حصّہ؟" بہشتو نے شاید تجربے کی بنا پر پوچھا۔

" جاؤ۔" فضلو گھبرا کر بولا۔

بہشتو اٹھی اور کراہی۔ پھر لمبی انگڑائی لی۔ اٹھتے ہوئے ہاتھ تیزی سے نیچے آ اور رانوں پر چٹاخ سے مارے، الٹے ہاتھوں سے آنکھیں مل کر اس نے دوپٹہ یوں ا سے لپیٹا جیسے تہجد پڑھنے چلی ہے، وہ بولی "تم کل والی بات سے خفا تو نہیں؟"

فضلو نے نفی میں سر ہلا دینا کافی سمجھا۔
"میں تو نوکر ہوں تمھاری، جب چاہو بلا لیتا۔" اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔
فضلو بالکل ہلکا پھلکا ہو کر وہاں سے نکلا۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ صاحب نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا، بہشتو نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ اس نے تو صرف بہشتو کو دیکھا تھا، اور عورت کو دیکھتا کون نہیں۔ خود فضلو نے بہشتو کو کئی بار دیکھا تھا۔ دیکھنے میں کیا برائی ہے۔ وہ کوٹھری میں واپس آکر بڑی گہری نیند سو گیا۔
صبح اسے مریاں نے جگایا۔ "یہ دیر تک سونے کی کیا عادت ڈال رہے ہو۔ چوکیدار کو یہ زیب نہیں دیتا۔" اس نے بڑے پیارے فضلو کو سمجھایا۔
پھر جب وہ صاحب کے پاس چائے لے گیا تو وہ بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اور کچھ گنگنا رہا تھا۔ آج اس کے چہرے پر بہت رونق تھی اور اگرچہ آنکھیں تھکی تھکی تھیں مگر اس کی تھکن میں ایک کیفیت تھی۔ فضلو نے اسے نہایت عقیدت سے دیکھا، دونوں مسکرائے اور صاحب بولا "معلوم ہوتا ہے آج دھوپ نکلے گی، بادل بھاگے پھر رہے ہیں۔"
"جی ہاں۔" فضلو نے اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ مارے عقیدت کے اس کا گلا بھرا آ رہا تھا۔
چائے پی کر وہ پھر کسی نئی عورت کی تلاش میں نکل گیا۔ اور نہایت آسانی سے سرائے کے بھٹیارے کی بیوی سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ خوب صورت تو نہیں تھی مگر اس کی شخصیت ایسی زوردار تھی کہ بڑی بڑی حسین عورتوں کے مجمع میں بھی سب پر چھائی رہتی تھی، اور اس کے ہونٹوں میں پکے پھلوں کی سی دعوت تھی۔ فضلو نے دن بھر اطمینان سے دوسرے کام کئے، رات کو وہ پرانے کھو تلے آ نکلی، اسے رئیس خانے تک پہنچایا، کوٹھری میں آکر سو رہا، ٹھیک وقت پر آنکھ کھلی، دبے پاؤں رئیس خانے تک پہنچا، لالٹین جل رہی تھی اور یوسف سو رہا تھا، ساتھ کے کمرے میں دیا روشن تھا اور جوان بھٹیارن پلنگ

پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، فضلو کو دیکھتے ہی وہ رونے لگی۔
"کیا بات ہے؟" فضلو نے اسے تسلّی دینے کا ارادہ کیا۔
"بات تو کوئی نہیں فضلو" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی" اور دُکھ کی بات بھی یہ ہے کہ کوئی بات ہے ہی نہیں۔ صاحب نے تو رات بھر مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا، پس بیٹھا دیکھتا رہا، دیر تک، کہنے لگا بس میں تمھیں دیکھوں گا۔ میں نے صرف دیکھتے رہنے کے لئے تمھیں یہاں بلایا ہے۔ سونا چاہو تو سو جاؤ، مجھے تو بس دیکھنا ہے"——
"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟" فضلو نے پوچھا۔
وہ اور زور سے روتے ہوئے بولی" روپے جو نہیں ملیں گے، صرف دیکھنے کے لئے کون دیتا ہے سو روپے؟"
فضلو نے سو روپے کا نوٹ بھٹیارن کو تھما دیا۔ وہ پہلے تو منھ کھولے سو روپے کا نوٹ دیکھتی رہی، پھر آنسو پونچھے اور چپکے سے باہر چلی گئی۔
فضلو دیر تک وہیں کھڑا رہا، پھر اس نے دیا بجھایا اور یوسف کے کمرے میں آیا وہ سو رہا تھا، فضلو کو اس کے چہرے کے ارد گرد ایک ہالا نظر آنے لگا۔ اس کے ماتھے میں سے لالٹین کی روشنی نکل رہی تھی" کتنا اچھا ہے میرا صاحب۔ کتنا پیارا ہے۔ کتنا نیک ہے۔ اللہ یہ ساون کبھی ختم نہ ہو—— اللہ یہ جھڑی کبھی نہ رُکے —— اللہ صاحب کبھی یہاں سے نہ جائے ——" وہ چپ چاپ باہر آگیا۔
آج وہ نئی عورت کے لئے باہر سڑک پر آیا ہی تھا کہ ایک دم بادل پھٹ پڑا اور سڑک پر جاتی ہوئی ایک عورت گھبرا کر پرانے کھوکے آ گئی۔ وہ کوٹھری کی طرف بھاگنا چاہتا تھا مگر اس عورت کو دیکھ کر اس نے قسمت آزمائی کی ٹھانی۔ پتلی دبلی سی تھی، مگر ناک نقشہ ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا چینی گڑیا میں جان پڑ گئی ہے۔
وہ اس کے پاس گیا" کہاں جانا ہے بہن؟"

"میانوالی جانا ہے۔" وہ پوٹلی کو دامن تلے چھپائے ہوئے بولی۔" وہاں میرا گھر والا جیل میں ہے ملاقات پر جا رہی ہوں۔"

"آج کی رات یہیں رہ جاؤ۔" فضلو نے کچھ سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"کیا؟" عورت نے حیرت سے پوچھا۔

"میں کہہ رہا ہوں' رات ہی کی تو بات ہے' یہیں میرے پاس رہ جاؤ۔ ایک صاحب آیا ہوا ہے۔ رات کے سو روپے دیتا ہے۔"

عورت تن کر کھڑی ہو گئی۔ پوٹلی نیچے گر کر ایک طرف سے کھل گئی۔ اس میں سے دیہاتی بسکٹ ۔ گو گڑے ۔ جھانکنے لگے ۔ اس نے چلا چلا کر فضلو کو اتنی بہت سی گالیاں دیں کہ وہ وہاں سے گھبرا کر بھاگا ــــ اپنی ماں بہن کو لے آ ــــ اپنی بہن کو بلا لا ــــ اپنی بیوی سے کہہ ــــ" دور تک اسے عورت کی آواز سنائی دیتی رہی ۔ وہ سڑک پر سے بڑی پگڈنڈی اور بڑی پگڈنڈی پر سے چھوٹی پگڈنڈی پر بھاگتا چلا گیا۔ معلوم ہوتا تھا عورت کی آواز اور بادل کی گرج اور موسلا دھار بارش اس کے تعاقب میں ہیں ۔ اس کا لباس' اس کے جسم سے چپک گیا ۔ مارے ٹھنڈ کے دانت بجنے لگے' ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے اور وہ بھاگتا چلا گیا ۔ اسے ڈر تھا کہ اگر مسافر عورت کی آواز کو مریاں نے سن لیا اور مریاں نے اسے بھاگتا دیکھ لیا تو کیا ہو گا ۔

آخر وہ ایک بنگلے کے پہلو والی کوٹھریوں میں ایک کوٹھری کا دروازہ کھلا دیکھ کر اس کی طرف بھاگا ۔ اندر ایک نوجوان عورت بیٹھی مٹھی بھر دال کو چنگیر میں پھیلائے اس میں سے کنکریاں چن رہی تھی ۔ فضلو کو دیکھتے ہی بولی: "پھنس گئے بارش میں؟"

"ہاں" اس نے کہا اور چولے اور چادر کو نچوڑنے لگا ۔

"بیٹھ جاؤ۔" عورت بولی ۔

وہ بیٹھنے کی جگہ منتخب کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگا ۔

ادھر چولھے میں کچھ آگ ہوگی۔" وہ بولی۔

فضلو چولھے کے پاس جاکر بیٹھ گیا، بارش اسی شدّت سے ہو رہی تھی۔

لڑکی کا چہرہ عام سا تھا، مگر اس کے ہونٹوں کے گوشے بڑے پیارے تھے۔ بھرے بھرے گالوں میں پھنسے ہوئے اور گہرے۔ بات کرتی تھی تو اس کے ایک گال پر دو گڑھے بنتے اور مٹتے رہتے تھے، وہ بولی۔ "تم رئیس خانے کے چوکیدار ہو نا؟"

"ہاں۔" اُس نے حیرت سے کہا اور پھر سوچا، یہ تو بہت بری بات ہوئی۔ یہ تو مجھے پہچانتی ہے ——

"تم یہاں کیا کرتی ہو؟" فضلو نے پوچھا۔

"نوکرانی ہوں، بیگموں کے جسم دباتی ہوں رات کو ——— دس روپے اور روٹی ——— کٹ رہی ہے۔"

"اکیلی؟"

"ہاں کوئی ہے ہی نہیں، سب ایک ایک کرکے مرتے چلے گئے۔ ماں بہیں پچھلے جمعہ کو مری ہے، کفن بیگم نے دیا تھا ———" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور رو الدیں مسکریاں مچلنے کے بجائے چہرے پر سے آنسو سمیٹنے لگی۔

فضلو کو یہ عورت بہشتو اور بھٹیارن سے کچھ الگ سی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو بہت کوسا کہ خواہ مخواہ مولوی بنا پھرتا رہا اور اسے آج تک یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ سکیسر پر وہ کون سی عورتیں ہیں جو آسانی سے خریدی جا سکتی ہیں۔ مسافر عورت کی گالیاں ابھی تک اس کے دماغ میں سوئیوں کی طرح چبھی ہوئی تھیں۔ وہ دیر تک لکڑی کے ایک ٹکڑے سے چولھے میں بجھے ہوئے انگاروں کو الٹتا پلٹتا رہا، پھر جب کافی دیر کے بعد بارش تھمی تو وہ اٹھا۔

"جاتے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

ہاں، اب چلیں"۔ اس نے کہا اور باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی اس نے اپنے آپ کو بڑا بزدل محسوس کیا، اگر وہ یہاں سے کچھ کہے بغیر پلٹ گیا تو پھر اور کون ہے سکیسر بھر میں۔ کیا وہ مرپاں سے جا کر کہے گا؛ اس نے وحشت میں اپنے بالوں کی ایک لٹ یوں کھینچی جیسے جڑ سے اکھیڑ لے گا، تو کیا وہ یہاں سے ناکام پلٹ جائے گا اور اس کے صاحب کی راتیں اجڑ جائیں گی۔ اور اس کے روز کے دس روپے، مہینے کے تین سو روپے الگ مارے جائیں گے ــــــ وہ گھوم کر پھر دروازے پر آ گیا۔

"کچھ بھول گئے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"ہاں!"

"کیا؟"

"ایک بات کہنا بھول گیا۔"

"کیا بات؟"

"ایک بات ہے۔"

"کیا بات ہے؟"

"ذرا سی بات ہے۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ "سو روپیہ ملیں گے۔"

"سو روپے؟" عورت نے حیران ہو کر کہا۔ "مگر کس بات کے؟"

"بس ایک رات کی بات ہے۔" فضلو نے بڑی جرأت سے کہا۔

عورت نے اس کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں بہت سے آنسو بھر گئے اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو اکٹھے بہت سے آنسو ایک دوسرے کے پیچھے چنگیر میں گرنے لگے اور وہ جیسے کنکریوں کے بجائے آنسو چننے لگی، چنگیر کو ایک طرف رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

فضلو شرمندہ ہو کر واپس چلا آیا۔ اس روز وہ سکیسر کے بنگلوں کے چکر پہ چکر لگاتا رہا۔ بہت سی نوکرانیاں، چوکیدارنیاں، سبزی بیچنے والیاں اور مسافر عورتیں اسے دکھائی دیں، مگر وہ کسی سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ صاحب کے سامنے بھی نہ گیا۔ شیردل نے بڑی مشکل سے ایک ایک کر کے برتن صاحب تک پہنچائے، اور پھر شام کو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی عورت سے ضرور بات کرے گا، آخر ایسی بزدلی بھی کیا ــــ وہ یہ فیصلہ کر کے سڑک پر آیا تو اسے ایک طرف بنگلے والی نوکرانی دکھائی دی۔ وہ اس کے پاس آئی، وہ اسی طرح رو رہی تھی، اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے، ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور ہونٹوں کے گوشوں میں تھرتھری تھی اس نے فضلو کی طرف دیکھے بغیر رکتے رکتے کہا۔ "آؤں گی۔"

فضلو کا اچھلنے کو جی چاہا، سرگوشی میں بولا "تو پھر عشاء کی نماز کے بعد بیگموں کے جسم کو دبا کر وہ اس کھوہ کے تلے آجانا۔ آجاؤ گی نا۔"

"آؤں گی۔" وہ بولی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرے جا رہے تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ سچ مچ کھوہ تلے آگئی۔ وہ اس وقت بھی رو رہی تھی اور جب وہ اسے صاحب کے کمرے میں چھوڑ کر برآمدے میں آیا اور پلٹ کر دیکھا تو وہ تب بھی رو رہی تھی۔

منہ اندھیرے اُس کی آنکھ کھلی، وہ رئیس خانے میں گیا۔ یوسف لالٹین جلائے سو رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں دیا جل رہا تھا اور وہ بستر پر پڑے سو رہی تھی۔ فضلو مسکرایا۔ اس نے عورت کے پاؤں کا انگوٹھا آہستہ آہستہ ہلایا، وہ جاگ اٹھی۔ پہلے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا، پھر ایک سکون بھری انگڑائی لی اور مسکرا کر بولی "میں تو ایسی ڈر رہی تھی، ایسی ڈر رہی تھی ــــــ خواہ مخواہ ڈرتی رہی۔ اس نے تو مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ بس دیکھتا رہا اور دیکھنے میں کیا پڑا ہے!"

مسکراتے ہوئے اُس نے چادر اوڑھی، مسکراتے ہوئے اس نے سو کا نوٹ لیا، مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی اور فضلو کو محسوس ہوا جیسے اس نے تین سو روپے چولھے میں جھونک دیئے، تین سو روپے ـــــ پندرہ بیسیاں! جن سے وادی میں ایک کچا گھروندہ بن سکتا ہے اور اگر تین سو اور مل جائیں تو ہل اور بیل خریدے جا سکتے ہیں یا دال گڑ کی ایک دوکان کھل سکتی ہے۔ اور پھر وہ کچھ کھاتا تھوڑی ہی نہیں کسی سے، بس دیکھتا ہے، جانے کیا دیکھتا ہے، اپنی مریم کی صورت دیکھتا ہے یا اللہ کی قدرت دیکھتا ہے، بس صرف دیکھتا ہی ہے نا۔ کچھ چھین تو نہیں لیتا، کوئی خرابی تو نہیں کرتا۔"

وہ دوسرے کمرے میں آ گیا، صاحب سو رہا تھا۔ وہ اسے کچھ دیر تک دیکھتا رہا، پھر اپنی کوٹھری کی طرف آہستہ آہستہ آیا اور جب دروازہ کھولا تو سامنے مریاں کھڑی تھی۔ ـــ وہ تیورا کر پیچھے ہٹا، اُسے بڑے زور کا چکر آ گیا، جسم کا سارا خون سر میں جمع ہو کر کھولنے لگا۔

"کہاں گئے تھے؟" مریاں نے تلخی سے پوچھا۔

"صاحب کے پاس۔" اس کے دماغ میں قسم قسم کے بہانوں نے آفت مچا دی۔

"اس وقت کیوں گئے تھے؟" اس نے اسی تلخی سے پوچھا۔

"اس کے سر میں درد تھا۔" ایک بہانہ اس کی زبان پر آ گیا۔

"کیا روز اسی وقت اس کے سر میں درد ہوتا ہے؟" مریاں نے سختی سے کہا۔ "تم آج تین چار دنوں سے جا رہے ہو۔"

فضلو نے دروازے کا سہارا لے لیا۔ اسے ایک اور بڑے زور کا چکر آ گیا تھا، گھبراہٹ پر بڑی مشکل سے قابو پاتے ہوئے بولا۔ "ہاں کچھ ایسا ہی درد ہے، اسی وقت ہوتا ہے۔"

"اور یہ رئیس خانے میں سے ابھی ابھی نکل کر کون گیا ہے؟" مریاں کے لہجے میں

جھریاں تھیں"۔ "تم کہو گے یہ صاحب کے سر کا درد تھا۔"

فضلو نے محسوس کیا جیسے اس کا دل پسلیوں کو توڑ کر باہر گر پڑے گا اور اس کا بھیجا تالو کو پھاڑ کر اوپر اڑ جائے گا، لیکن اس نے ایک دم بڑے زور کا کھسیانا قہقہہ لگایا اور بولا: "چلو تمہیں ساری بات بتا ہی دوں تم سے کیا پردہ، بالکل ذرا سی بات ہے، کوئی ایسی ویسی بات نہیں، راستہ دو۔"

وہ اندر کھاٹ پر بیٹھ گیا، شیرو سو رہا تھا، چراغ کی لو بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی اور کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ مریاں اپنی کھاٹ پر بیٹھنے لگی تو فضلو نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس گھسیٹ لیا۔ "ادھر میرے پاس بیٹھو، تین دن سے سؤر کی بچی نے ایک جھپکی تک نہیں دی۔"

"حرام زادے گالی بکتا ہے۔ وہ بولی" اب بتا کیا بھید ہے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر جاتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو میں سوتی رہتی ہوں۔ آج بھی تمہیں باہر جاتا دیکھا تو کہا لاؤ ذرا دیکھوں تو یہ جاتا کہاں ہے، اور جو دیکھا تو ایک عورت اندر سے نکلی اور سڑک کی طرف چلی گئی۔ شور مچا دیتی، پر تمہاری بدنامی کا ڈر تھا۔ صاحب نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں؟ کیا ہم کنجر ہیں! اور کیا تمہارا ہاتھ ہے اس میں۔؟"

"تم نہیں جانتیں"۔ وہ بولا۔ اندر سے گھبرا رہا تھا، اس کی نسیں تنی ہوئی تھیں۔ اور آنکھیں ویران ہو رہی تھیں، اس کی کنپٹیوں کی رگیں صاف تڑپتی ہوئی نظر آ رہی تھیں مگر جھوٹ موٹ کے اطمینان سے اس نے اپنی آواز ضرور سنبھالے رکھی۔ اس نے اپنا ایک بازو مریاں کی پیٹھ پر پھینک کر اس کا شانہ پکڑ لیا اور بولا: "یہ صاحب تو مجھے بڑا اللہ والا معلوم ہوتا ہے مریاں، یہ تو کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہے، سوچو تو، ایک جوان عورت اس کے سامنے رات بھر بیٹھی رہتی ہے، وہ جو چاہے اس سے سلوک کرے، پردہ ہے کہ میٹھا دیکھ رہا ہے، عورت کو چھوتا تک نہیں، صرف دیکھ رہا ہے اور صبح سے

پہلے ایک سو روپے دے کر اسے چلتا کرتا ہے، سُن رہی ہو؟ —— ایک سو روپیہ —— پانچ بیسیاں —— اور وہ صرف دیکھتا ہے۔"

فضلو نے محسوس کیا کہ مریاں کا سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو رہا ہے۔

"سُن رہی ہو مریاں؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"اور یہ عورتیں لاتا کون ہے؟" مریاں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

فضلو نے ہیر پھیر کی کوشش کی۔ "بھئی اس میں بُری بات ہی کون سی ہے۔ اب تم کتنی بار چشمے سے پانی لینے گئی ہو، کتنوں نے تمھیں دیکھا ہے، تو کیا میں ان سب کی آنکھیں نکال لوں؟ دیکھنے میں کیا رکھا ہے اور صاحب عورتوں کو صرف دیکھتا ہے —— اس نے تیس روپے نکال کر مریاں کی گود میں رکھ دیے۔

مریاں نے نوٹوں کو نفرت سے نیچے گراتے ہوئے کہا: "پر لاتا کون ہے عورتیں؟"

"بھئی کوئی بھی لائے، وہ کچھ کہتا تو ہے نہیں۔ تکتا ہے اور سو روپے نکال دیتا ہے۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ آہستہ سے بولا: "میں ہی لاتا ہوں۔"

مریاں نے فضلو کا ہاتھ اپنے شانے سے جھٹک دیا۔ اور ایک دم رونے لگی۔ فضلو مریاں سے لپٹ گیا، اس کی پیٹھ اور گردن اور بالوں کو چوما، اور بولتا چلا گیا۔

"مجھے خدا کی قسم مریاں، قرآن کی قسم —— مریاں مجھے تمھاری قسم، آج تک تین عورتیں لایا ہوں اور تینوں پاک صاف واپس گئی ہیں۔ ایک بہشتن ہے، ایک سرائے والی بھٹیارن ہے، ایک ادھر ایک دکھنی بنگلے کی نوکرانی ہے۔ تینوں تین سو روپے لے گئیں اور وہ انھیں دیکھتا رہا، بس دیکھتا رہا، سُن رہی ہو؟ اس نے انھیں چھوا بھی ہو تو نیزہ رے، میں مروں، تم مر جاؤ۔"

مریاں نے آنسو پونچھے اور بولی: "پتہ ہے تو کس کا بیٹا ہے؟"

فضلو ہنسا: "تو کون کہتا ہے کہ میں اچھی بات کر رہا ہوں، اور یہ بھی کون کہتا ہے

ہے کہ میں کوئی بری بات کر رہا ہوں۔"

"بری بات تو ہے ہی" مریاں نے کہا، مگر اب اس کا لہجہ اتنا سخت نہ تھا۔

"کیسے بری ہے"؟ اس نے مریاں کو اپنی طرف کھینچ کر مجبور کر دیا کہ وہ اس کے سینے کا سہارا لے کر بیٹھے اور وہ اُٹھ گئی۔" ایک عورت کو سامنے بٹھا کر کچھ دیر دیکھتا ہے اور اسے سو روپے دے کر اپنے کمرے میں آ کر سو رہتا ہے۔ بتاؤ اس میں کون سی بری بات ہے؟"

مریاں خاموش رہی۔

"میں تو کہتا ہوں بہشتو کی جگہ پہلے دن سے تمہیں کو وہاں بٹھا دیتا تو کچھ ایسی خراب بات نہ تھی۔

مریاں اس کی گرفت سے چھوٹ کر وحشت سے قدم اُٹھاتی شیرو کے پاس گئی، اس کے مُنھ پر سے کھیس نوچ لیا اور بولی "اسے دیکھ رہے ہو"؟

شیرو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور رونے لگا، فضلو نے لپک کر اسے لٹایا، تھپکا اور پھر مریاں سے پوچھا ____ "مجھے تم نے ایسا ہی کمینہ سمجھ لیا ہے؟ میرے چھے سال تمہارے سامنے ہیں۔ میں اپنی مریاں کو کسی دوسرے کے حوالے کر دوں گا؟ چوٹی پر سے نیچے چٹانوں پر نہ کود جاؤں گا اس کے بدلے! سو کی بچی۔ یقین ہی نہیں کرتی۔ مفت میں روز ایک سو روپیہ مل رہا ہو تو ہمارا بگڑے گا کچھ نہیں اور بنے گا بہت کچھ ____ اور ابھی ساون کے دس بارہ دن باقی ہیں، ہم آسانی سے ایک ہزار کما کر نیچے وادی میں جا سکتے ہیں اور عزت سے جی سکتے ہیں، وہ تمھیں صرف دیکھے گا، تم اسے دیکھتی رہنا۔ قصہ ختم۔"

لیکن مریاں پر تو ایک ہی وحشت سوار تھی، وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی، پھر زور زور سے پاؤں پٹخنے لگی "بے شرم، بے حیا۔" وہ چیختی رہی اور دروازے میں بہت سی جھریاں اگ آئیں۔ باہر درختوں پر چڑیاں اور کوّے بولنے لگے تھے اور بادل کہیں بہت دور گرج رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور کہتی رہی "بیٹھے بیٹھے کنجر پنے پر اُتر آیا

، کمینہ کہیں کا۔ حرام زادہ۔ شرم نہیں آتی۔ جوتوں سمیت گھسا آرہا ہے آنکھوں میں۔
ک جلاتا ہے اوراوپر سے تیل گراتا ہے اور کہتا ہے آگ بجھ رہی ہے. کہتا ہے یہ آگ
ہیں جل رہی، یہ تو چاند چمک رہا ہے اور مجھ سے کہہ رہا ہے اس کے پاس رات بھر رہنے کو۔
م سے!" وہ سینہ کوٹ کوٹ کر زور زور سے رونے لگی۔
فضلو شیرو کی کھاٹ سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا، اس سے لپٹ جانا چاہا،
ر وہ چھوٹ کر پرے جا گری، فضلو نے اٹھ کر اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا،
ریاں نے اُس کی طرف امید سے دیکھا۔
وہ بولا: "ارے وہ کچھ بھی نہیں کہتا!"
مریاں پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
فضلو بولتا رہا: "سور کی بچی، تمھاری قسم کھا کر کہہ چکا ہوں کہ وہ تو چھوتا تک
ہیں، بس دیکھتا ہے اور تھوڑا روپیہ دے کر سور ہتا ہے۔ تو مانتی ہی نہیں"۔
اچانک مریاں تن کر کھڑی ہو گئی اور بولی: "اگر تم ایسے ہی بے غیرت ہو گئے ہو
ر ایک شرط ہے!"
"بتاؤ" فضلو بھی کھڑا ہو گیا۔
"میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ اس پر قائم رہو گے!"
"پہلے شرط بتاؤ" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"میں رات صاحب کے پاس جاؤں گی۔ اگر اس نے مجھے چھو لیا تو پھر میں تمھاری
نہیں رہوں گی، پھر میں جہاں چاہوں گی، چلی جاؤں گی"۔ اس کی آواز میں کوئی اتار
چڑھاؤ نہ تھا۔
فضلو نے بغیر کسی جھجک کے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مان لی شرط۔ تو سمجھتی
ہے کہ تینوں کی تینوں جھوٹ بولتی ہیں، تو سمجھتی ہے میں ایسا ہی ذلیل ہو گیا ہوں"۔

"خدا کی قسم بھی کھاؤ۔" مریاں نے کہا۔

"خدا کی قسم بھی کھاتا ہوں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "ارے وہ تو صرف دیکھتا ہے۔ اچھا، میری بھی ایک شرط ہے۔"

"کہو۔"

"اگر وہ تمھیں چھوئے تک نہیں تو جب تک وہ یہاں ہے تم اس کے پاس جاتی رہو گی"

مریاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "قبول ہے۔"

وہ باہر جا کر چائے کا سامان کرنے لگی۔

"اور اس نے تمھیں دیکھا تک نہیں مریاں۔" اس نے باہر جا کر کہا۔ "اسے تو یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ تم ہو کون؟"

وہ خاموش رہی، وہ دن بھر خاموش رہی اور جب شام کا کھانا بھی ہو چکا اور شیرو سو گیا تو وہ پہلی بار بولی۔ "چلو۔"

اس کی آواز میں اتنے بہت سے کانٹے تھے جو فضلو کے کانوں کے پردوں میں گھس گئے، مگر وہ اٹھا اور کوٹھری سے باہر آ گیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ پھر جب وہ صحن میں پہنچے تو مریاں نے آہستہ سے کہا۔ "فضلو!"

فضلو رک گیا۔ "ہاں۔"

وہ بولی۔ "شرط یاد ہے نا؟"

"یاد ہے۔" فضلو بولا۔ "بے فکر رہو۔"

اور جب وہ مریاں کو ... کے کمرے میں چھوڑ کر اور ایک سو دس روپے لے کر باہر صحن میں آیا تو پلٹ کر د... کھڑکی اور دروازہ دونوں بند ہو چکے تھے، روزن تو بند ... جلتے تھے اس وقت ـــــ وہ کوٹھری میں آیا وہاں جیسے بھوت کونوں پر دبکے بیٹھے تھے اور چراغ کی لو میں ایک چڑیل ناچ رہی تھی اور وہ شیرو کی کھاٹ پر بیٹھ گ

ر اسی کے پاس بیٹ گیا۔ شیرو کچی نیند میں تھا، بولا: "کیا ہے؟ کون ہے؟"
"میں ہوں۔" فضلو نے پیار سے کہا۔ "آج میں اپنے بیٹے کے پاس سوؤں گا۔"
شیرو مارے خوشی کے اس سے لپٹ گیا۔ اور پھر اپنی گرفت کو ڈھیلا کر کے
دگیا۔ فضلو دیر تک اسی طرح اکڑا پڑا رہا اور جب کمر دکھنے لگی تو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے
ا۔ کتنی دیر تک وہ ٹہلا کیا، پھر چراغ بجھا کر سونے کی کوشش کی، مگر پھر بھڑک کر
ٹھا، چراغ جلایا اور اسے مریاں کی کھاٹ کے پلنگے پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کی نوک کو
ر تک دیکھتا رہا۔ باہر شاید بادل کھل گئے تھے، کیونکہ سفید چاندنی نے جھریوں میں
ان ڈال دی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آیا، مگر رئیس خانے کی طرف نظر اٹھتے ہی
، بھاگ [illegible] اندر آ گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ اس سے کچھ یوں لگ کر کھڑا ہو گیا جیسے
، وہ دنیا کی کسی طاقت کو اپنی کوٹھری میں نہیں گھسنے دے گا۔ وہ دیر تک اسی طرح کھڑا
ہا حتیٰ کہ پہلے مرغ نے کہیں دوبارہ بانگ دی۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز
ہو گئی کہ اس کے لئے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا، وہ کھاٹ پر لیٹ گیا، پھر بیٹھ گیا، پھر
کھڑا ہو گیا اور دھم سے دروازہ کھول کر رئیس خانے کی طرف بھاگا۔
ایک موٹر رئیس خانے کے پہلو سے نکل کر سڑک پر آ گئی اور ناگن کی طرح تیزی سے
نیچے نیچے وادی کی طرف تیر گئی۔ فضلو پاگلوں کی طرح سرپٹ بھاگا۔ رئیس خانے کا
دروازہ بند تھا، اس نے دروازے کو گھونسوں سے کوٹ ڈالا۔ "مریاں"۔ وہ چلایا۔ اور
مریاں کے نام کے حروف بہت سی اونچی نیچی چیخیں بن کر پہاڑوں میں بجنے لگے۔ دور موڑ
کاٹتی ہوئی موٹر کی روشنی اس کے فق چہرے پر سے گزرتی ہوئی غائب ہو گئی۔ اس نے
موٹر کا پیچھا کرنے کے لئے نیچے گھاٹیوں کی طرف کود جانے کی سوچی، اور پھر آہستہ
سے دروازہ کھولا، لالٹین کی روشنی باہر برآمدے میں سے گزرتی ہوئی صحن کے ایک
حصے تک جا رہی تھی، دروازہ مریاں نے کھولا۔

آپ ہو کچے۔" مریاں نے کہا۔" تم شرط ہار گئے ہو حرام زادے"۔ اس کی آواز
گئی ـــــ پھر وہ پھوٹ کر رونے لگی۔" کمینے، ذلیل، وہ مجھے لوٹ لے گیا، اس نے تو مجھے
بھنبھوڑ ڈالا، رات بھر وہ مجھ سے چمٹا رہا۔ اس نے مجھے نوچا، کھسوٹا، اس نے میرے
گال چاٹ ڈالے، اس نے۔"

مگر فضلو وہاں نہ تھا، وہ سر جھکائے کوٹھری کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بدلی نے
چاند کو چھپا لیا تھا، ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی اور کوٹھری میں شیرو رونے لگا تھا۔
مریاں اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ اور روتی اور بلکتی ہوئی بھرائی ہوئی آواز میں بولتی چلی
گئی۔" تم نے کہا تھا کہ وہ مجھے چھوئے گا ہی نہیں، اور اس نے تو مجھے کاٹ کاٹ لیا ہے۔ اور
تو پچھلے ساون میں بھی میرے ہی لئے یہاں رکا رہا۔ اس نے تو پہلے ہی دن یہاں صحن میں
مجھے دوربین سے دیکھ لیا تھا۔ وہ تو اب کے بھی میرے ہی لئے آیا تھا، سن رہے ہو؟ سُن
رہے ہو حرام زادے؟ بھاگے کہاں جا رہے ہو؟"

فضلو اب نہایت تیز تیز چل رہا تھا اور مریاں اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی
وہ بولتی گئی۔ تم شرط ہار گئے، لیکن وہ سو روپے تم اپنے پاس رکھو، کہیں سے عزت آبرو
ملے تو چٹکی بھر خرید کے رکھ لینا، کیونکہ آج سے تم پرلے درجے کے بدذات کمینے اور کنجر
ہو گئے ہو، سمجھے؟ اور اب میں جا رہی ہوں۔ میں جہاں کہیں بھی جا رہی ہوں تمہیں
اس سے کوئی واسطہ نہیں، میں کسی کی نہیں رہی، تم نے غرور توڑ دیا ہے۔ تم نے میرا
سب کچھ لٹوا دیا ہے حرام زادے۔"

فضلو اپنی کوٹھری کی دیوار سے ٹکرا گیا، تیورایا اور پھر دیوار کو ٹٹول ٹٹول
دروازے کی طرف رینگا۔ اندر شیرو زور زور سے رو رہا تھا، اور مریاں چیخے جا رہی تھی
"وہ دو مہینے اس ایک گھڑی کے لئے سکیسر پر پڑا رہا اور وہ "مریم مریم" کی رٹ لگا
اور رونے کے بعد مجھ پر یوں جھپٹا جیسے کتا کچے گوشت پر جھپٹتا ہے، کرائے کی موٹر

س نے رات ہی انتظام کر لیا تھا، اور وہ ابھی ابھی مجھے آخری بار جھنجھوڑ کر موٹر میں بیٹھ کر لاہور چلا گیا ہے اور تمھیں بخشیش دے گیا ہے سو روپے کی اور ایک ایسی مریاں کی جو اب اس کی کوٹھری میں نہیں گھسے گی۔ وہ نیچے وادی میں اتر جائے گی۔ وہ ادھر میدانوں میں چلی جائے گی اور جب بھوک کے مارے اس کا پیٹ زخم بن جائے گا تو کپڑے اتار کر راستے میں بیٹھ جائے گی۔ ننگے مردوں کو لوگ پتھر مارتے ہیں پر ننگی عورتوں کو لوگ بستر دیتے ہیں اور روٹی کھلاتے ہیں۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے"!

آس پاس کے بنگلوں میں کتے مریاں کی چیخیں سن کر بھونکنے لگے تھے اور سکیسر کی پہاڑیاں جھیل کی طرف اترتی ہوئی موٹر کی بھنبھناہٹ کو دہرائے جا رہی تھیں اور مریاں کی واویلا کو دہرائے جا رہی تھیں اور کتوں کی آوازوں کو دہرائے جا رہی تھیں۔

پھر ایک دم مریاں پر جیسے وحشت سوار ہو گئی۔ لپک کر اس نے لڑکھڑاتے ہوئے فضلو کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا۔ فضلو سر اور گھٹنوں کے بل دھپ سے گیلی زمین پر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

وہ پلٹی اور کوٹھری کی پچھلی طرف پرانے کھو کے نیچے سے گزرتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔ سر پر ہاتھ رکھے وہ روئے جا رہی تھی اور نیچے ولوی کی طرف بھاگی جا رہی تھی اور چاند بدلی کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔

ایک موڑ پر جا کر وہ تھم گئی۔ شیرو کی چیخیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ "اس دوسرے حرام زادے کو ایک آخری بار دیکھ لوں"۔ اس نے فیصلہ کیا اور واپس رئیس خانے کی طرف بھاگی۔

فضلو اسی طرح دروازے کے پاس سر اور گھٹنوں کے بل، بے حس و حرکت اوندھا پڑا تھا۔ شیرو کا گلا چیختے چیختے بیٹھ گیا تھا۔ مریاں نے دروازہ کھول کر شیرو کے پاس جانا چاہا مگر پھر جیسے بجلی کی سی تیزی سے فضلو کے پاس آ گئی۔ ایک لمحہ بت کی طرح جمی رہی۔ پھر جھک کر اسے بٹھانا چاہا تو وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ کیچڑ اور لہو نے اس کے چہرے کو نہایت خوفناک بنا دیا تھا اور اوپر بدلیوں میں دوڑتے ہوئے چاند نے اس گھناؤنے پن کو چمکا دیا تھا۔

"میرا فضلو!" اماں نے فریاد کی۔

پھر اندر کوٹھری میں جاکر چراغ اُٹھایا۔ شیرو بھاگ کر آیا اور اس کی ٹانگ سے لپٹ گیا۔ وہ چراغ اٹھائے باہر آئی تو شیرو بھی اس کا پلّو تھامے باہر چلا آیا۔ وہ چراغ کو فضلو کے چہرے کے قریب لاکر اور اس کے پپوٹے اٹھاکر اس کی پتلیوں میں زندگی کے آثار ڈھونڈنے لگی۔

"میرا فضلو! میرا مالک، میرا سائیں!" اس کے بین چاروں طرف گونج اُٹھے! پھر ایکا ایکی تھم گئے۔ فضلو کی آنکھیں ذرا سی کھلیں، اس کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھا، مٹھی کھلی اور اس نے مٹھی میں دبے ہوئے سو روپے کے نوٹ کو چراغ کی لَو سے جلاتے ہوئے ہولے ہولے کہا ــــ "میں تمھیں نہیں جانے دوں گا، تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔

شیرو اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ تھامے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے میری غریبی دھوکا دے گئی مریاں"! فضلو نے رکتے رکتے کہا۔

نوٹ کی راکھ سکڑ کر گری اور رکیس خانے کی طرف اُڑ گئی۔

"مریاں" نے فضلو نے التجا کی۔

"تم مروگے تو نہیں"! مریاں نے سسکیوں میں پوچھا۔

"نہیں"! فضلو نے بڑے یقین سے کہا۔

حرام زادے۔ وہ بلک بلک کر روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

سؤر کی بچی" وہ اس کے بالوں کو خون آلود ہونٹوں سے چومنے لگا۔

موٹر نیچے جھیل کے کنارے کنارے تیرتی جارہی تھی۔

○

سعادت حسن منٹو

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا بھی تبادلہ ہونا چاہئے۔ یعنی جو مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول۔ بہر حال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے۔ وہیں رہنے دیئے گئے تھے۔ باقی جو تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لئے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پر پہنچا دیئے گئے۔

ادھر کا معلوم نہیں۔ لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ "زمیندار" پڑھتا تھا اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا "مولبی ساب یہ پاکستان کیا ہوتا ہے"؟ تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا "ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں"۔

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک اور سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا۔ "سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے —— ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی"۔

دوسرا مسکرا دیا "مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے —— ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے یہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرے دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے؟ اس کا محل وقوع کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا

اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا ——— میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں ——— میں اسی درخت ہی پر رہوں گا۔

بڑی مشکل کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس سی۔ پاس ریڈیو انجینئر جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا۔ یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفع دار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند

کردیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں مبتلا ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنھوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دئیے ــــــ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس خیال سے کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت رنج ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یوروپین وارڈ رہے گا یا اڑا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنی پڑے گی۔

ایک سکھ پاگل جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان پر عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین"۔ دن میں سوتا تھا نہ رات میں۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں۔ مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ"۔

لیکن بعد میں آف دی پاکستان گورنمنٹ کی جگہ اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتہ ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے گا۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے گا۔ اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہو جائیں گے۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کے بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لیے داڑھی اور بال آپس میں جم گئے تھے۔ جن کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ادھر آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے۔ مہینہ کون سا ہے۔ یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھ میں آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی ہے۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں۔ پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ اور اس کے لئے پھل مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے

پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو یقیناً اسے بتادیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک دن بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں، تو اس نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور کہا "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں لگایا۔

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ اسے حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اس پر برس پڑا۔ "اوپڑدی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح۔ جو بولے سو نہال ست سری اکال۔"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے میں کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا۔ "یہ تم سے ملنے آیا ہے ــــ تمہارا دوست فضل دین ہے۔"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ــــــ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ــــ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی میں نے کی ــــــ

تمھاری بیٹی روپ کور ــــــــ

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا ــــــ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔

" بیٹی روپ کور "

فضل دین نے رک رک کر کہا " ہاں .... وہ ...... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی "

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا " انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری خیر خیریت پوچھتا رہوں ــــ اب میں نے سُنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ــــ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے سلام کہنا ــــ اور بہن امرت کور سے بھی ...... بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔ ــــ وہ بھوری بھینس جو وہ چھوڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ــــ دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی .... اور .... اور میرے لائق جو خدمت ہو کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں .... اور یہ تمھارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں "

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا " ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے ؟ "

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا " کہاں ہے ؟ ــــ وہیں ہے جہاں تھا "

بشن سنگھ نے پوچھا " پاکستان میں یا ہندوستان میں ؟ "

" ہندوستان میں ــــ نہیں نہیں پاکستان میں " فضل دین بوکھلا سا گیا۔ بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے مُنہ "

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ سخت سردیاں تھیں۔ جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے اُن کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ادھر اُدھر بھاگ اٹھتے تھے۔ جو ننگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے ــــــ کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں۔ بک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ــــــ پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا۔ اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ چند جو کچھ سوچ رہے تھے "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

متعلقہ افسر ہنسا" پاکستان میں"

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا" ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے ـــــ اور زور زور سے چلانے لگا" اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان"

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ـــــ ادھر ادھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا، اوندھے منہ لیٹا تھا۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا ـــــ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

○

عصمت چغتائی

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ جیسے کوئی بڑی واردات نے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منحنی سا چڑا بچہ رصد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اُٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال!" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی دھان ملے چاول دھوپ میں پھٹک رہی ہو۔ اور پھر ہنکارے بھر کر خاموش باتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں، ٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لئے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان نگنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ

بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار
کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر
بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی
کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھنٹا کرتیں اور دل ہی دل
میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین کے لئے گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لئے کترن میری بقچی سے لے لو"
اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں
کی ناپ تول ہار جائے گی، جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں
کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکن نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے
کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر
شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح
ایک دم اجاگر ہو گئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو! اور انہوں نے مسکرا کر
قینچی اٹھا لی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس ابھری۔ گود کے بچے بھی
ٹھسک دے دئے گئے، چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے جھپا جھپ سوئی کے ناکوں میں
ڈورے پروئے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل
پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے
دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور

ھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈھی کے پاس بیٹھی
ن ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ جھپکی اس کے
ی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پورے پورے
ں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان
ی روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی
وں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس لیے شبنمی دوپٹے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑھے کے بھاری
یے صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں
ڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا
تا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ
میدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلھن چھانٹی جاتی۔
دری کے چوکے پر صاف ستھری چاندنی بچھتی۔ محلہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں
بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو اتر آئے گی، پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بوا لو اور سنو۔ تو کیا نگوڑ ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟" اور پھر سب کے چہرے
سند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیا گر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتی
یویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہے لگاتیں۔ ایسے میں
ستا جی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو
یاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں
اری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا
اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس

بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! یہ قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے؟"

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھ بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جا اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جا تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔ یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نـ آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آجائے تو لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جو کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جا نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے ز سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کترن بھی بچتی تو تیلے دانی یا کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آگئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے۔ سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم ابا آگئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سـ کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھـ ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہلـ اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ ہنستے اور کھانسی سینے میں بے طرح الجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آکر انھیں سہارا د پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟"
اچھو کے دباؤ سے سُرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی
رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔
"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے؛ کتنی بار کہا تم سے؟"
"بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ
اور آدھی چھٹانک مکھن۔"
"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے اوپر سے
چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔"
"دکھاؤں گا۔" ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔"
"آگ لگے اس موئے حقّے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف
بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔"
اور ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔
کون کہتا تھا کہ جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی
سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں
ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں نہ اُس کے سینے پر طوفان اُٹھے،
اور نہ کبھی ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی
سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ
نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔
ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انھیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم
یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا۔ اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔ اور کبریٰ کے
پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے

ئے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے۔ اور ایک نئی جوانی سانپ کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا، وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کرکے شبرات کے مہینے میں کریب کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس ٹریننگ کے سلسلے میں آرہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے ایکدم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جیسے چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی۔ اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منھ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ "بہن میرا مری کا منھ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں۔ جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منھ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کرکے شام تک تولہ بھر گوکھرو چھ ماشہ سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتی گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔

میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔
صبح راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔
جب سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے
نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔ "لاؤ میں
دھو دوں بی آپا۔" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔
"نہیں۔" وہ شرم سے جھک گئی۔
حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریب کے دوپٹہ میں لپا ٹانکتی رہیں۔
جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب
بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر
دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے،
بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا سا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت
کے لچھے کھلاتیں۔
"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔" وہ حمیدہ کو منہ پھیلاتے دیکھ کر کہا کرتیں۔ اور
وہ سوچا کرتی۔ "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو
کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے
تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ
اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے۔ اور کیوں نہ بھرے۔ آخر کو وہ ایک
دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے
پیڑ دے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے
لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور
اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھا۔ کانوں میں شہنائیاں

بجنے لگتیں۔ اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑا
کو پیار سے تہ کرتیں۔ جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہو
جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں۔ بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے
رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سوئٹ ڈری
کاڑھتیں۔ پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے
پراٹھے ڈٹ کر کھاتا۔ اور شام کو آکر کوفتے کھا کر سو جاتا۔ اور بی اماں کی منہ ب
بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بے چارہ"۔ بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک
ہے پر بھئی کچھ تو پتا چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے"۔

"اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہ
دیکھا ہے کسی نے"۔ بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردا تڑوانے کو کون کہے ہے"۔ بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انھ
بی اماں کی دوراندیشی کی داد دینی پڑی۔

"اے بہن، تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھو
نگوڑی کون سی بکر ید کو کام آئے گی؟" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی۔

"اری او ناک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، ا
واری چل دیوانی"۔

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے"۔

"اے ہے، وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔" بی اماں چڑ کر بولیں۔

"نہیں تو۔ مگر........" میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں چپکے سے بولیں۔

"دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی۔" میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجئے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر چوپٹی کے پاس رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خناس آنکھیں ہیں۔" جا نگوڑی ماری ارن دیکھ تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کرکرا ہو جا... گیا۔"

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لوٹی ہوئی برات کا غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہئے تھا کہ مذاق اڑاؤں۔ قہقہہ لگاؤں کہ "واہ جی واہ دولھا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو۔" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا۔ اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد۔

"بتائیے نا؟"

"ارری ٹھیک سے جا کر پوچھ" بی اماں نے ٹھوکا دیا۔
"آپ نے لا کر دیئے۔ اور ہم نے کھائے۔ مزیدار ہی ہوں گے"۔
"ارے واہ رے جنگلی" بی اماں سے نہ رہا گیا۔
"تمھیں پتہ بھی نہ چلا، کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے"۔
"کھلی کے؟ ارے تو روز کا ہے کے ہوتے ہیں؟ میں تو عادی ہو چکا ہوں کھلی اور بھوسا کھانے کا"۔

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دو گنی سلائی کی۔ اور پھر شام کو جب میں کھانا لے کر گئی تو بولے

"کہیے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے"۔
"کیا ہمارے یہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔
"یہ بات نہیں۔ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری"۔

"میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھنسائیں۔ میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں"۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں پھکی رہتیں۔ بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں۔ اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا۔ کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کہ کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمھارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔

مگر بی آپا کے اُلجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اُڑتی ہوئی راکھ...... نہیں .... میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے ناس جائے اس کم بخت نزلہ کا۔ بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھے پکارا۔" اونہہ! میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلیٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

" آپ ہم سے خفا ہو گئیں" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑلی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر"

" کیا کہہ رہے تھے ؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

" کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں..... اوہ نہیں.... کھانہیں بلکہ چوم لوں" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہٹا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔" یہ ہاتھ!" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں جوتے صاف کرتے ہیں۔ یہ بےبس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہو گی کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

" اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے، پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی اگر راحت کے کان ہوتے تو..... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ

" اور کہہ رہے تھے کہ اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں"

" چل جھوٹی"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ......"

"اری چپ مُردار!" انھوں نے میرا منھ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔"

"نہیں بی آپا۔ انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمھاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر کہہ نہ سکی۔

"آپا بی تم خود کیا پہنو گی۔؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جُھلس رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا۔

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بُنا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منھ نوچ لوں کمینے۔ مٹی کے تھودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بُنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے۔ اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کے گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرا نہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ چولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیے

ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔
مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں کہ میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کردیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں بھوک اور کال کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ چاپ ہو جانے کی باتیں۔

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجیے۔ دیکھیے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے؟"
جنگلی بلّی کی طرح میں نے اس کا منھ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے۔ اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے۔ اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھی۔

"وہ بولے؟" ان سے نہ رہا گیا۔ تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔
"بی آپا۔ یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔" میں نے سوچا کہ میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔
"کیوں؟" وہ مسکرائیں۔
"مجھے اچھے نہیں لگتے ...... دیکھیے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔
"بڑے شریر ہیں۔" انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔
"بی آپا ...... سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔" میں نے سلگ کر کہا "آج میں اماں سے کہہ دوں گی۔"
"کیا ہوا؟" بی اماں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔
"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں۔"
"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے بولیں۔
"ہاں!"
"خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی مو

...بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں"۔ پھر چمکار کر بولیں "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لیجیو۔ وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔ یہ کہہ کر انھوں نے نیت باندھ لی۔

منھ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر ازحد خوشلودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تو تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے"۔

اور وہ مجھے بہنوئیوں کے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں۔ کہ کس طرح انھوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو نمبری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بے چارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے جہاں سُنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں ستانا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں۔ کبھی سویوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے، پانی آئے، کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا۔ کہ ان کے یہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہا "کسی سے بھی کرا دو"۔ اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی۔ کہ دیکھو تو جیسے بچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی"۔

"ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو۔ اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری

اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟ بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن، آجکل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بینگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہیں پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر آ بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

"کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہو گا۔"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منھ سے پھوٹے اور نہ ہی ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چسانے کو جا بیٹھی۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہو گی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی نکل جائیں گی۔ آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا غبار نہیں اترا تھا تھکے ہارے دیے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے"۔ ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولھا کے منھ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے۔ جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے۔

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں۔۔۔۔ چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔ بی آپا کی حیا سے بوجھل آنکھیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریہ کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے"۔ بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے۔"

حمیدہ کا گلا بھر آیا۔۔۔۔۔

"جاؤ نہ میری بہنو"! بی آپا نے اسے جگا دیا۔ اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ ۔۔۔۔۔ یہ ملیدہ"۔ اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے پیر لرز رہے۔ جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا۔۔۔۔۔! اور منھ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی۔ جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدے کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منھ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا۔ نیچے تعفن اور تھاہ غار کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔
نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلے کی بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔
صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔
اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ دق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی ت میں انھیں دبوچ لیا اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی ش میں سونپ دیا۔
اور پھر اس سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا۔ موت کے آنچل کی طرح بی اماں سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک تھی۔ گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ جیسے ان میں ل اژدہے پھنکار رہے ہوں۔
لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چوپرتہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت ل چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا۔ انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے۔
ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ ہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر..... سفید گزی

کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے ا
سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور
سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکا بھر کے ڈورہ توڑ لیا
دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگتے
ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا د
جیسے آج انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوہا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہ
کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی ++

حیات اللہ انصاری

آخری کوشش

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا :

"ٹکٹ !"

گھسیٹے نے گھگھیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ماں کی گالی دے کر اسے جا ٹک کے باہر ڈھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں ور کیا ہی کیا جا سکتا ہے ؟

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سُنیں، ٹھوکریں سہیں، بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن پیدل بھی چلنا پڑا، ایک دن کے سفر میں ٹمیس دن لگے مگر ان ہاتوں سے کیا ؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے ــــــ وطن ! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے جب میں کلکتہ پہنچا تو کالی بل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آ گئے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچا راستہ اور ـــــ دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا د کانوں کے تختے یا پھر شہر سے میلوں دور ٹھیکہ دار کی جھونپڑیا جس کی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا، سب غرض کے بندے، بے ایمان، حرام زادے، ایک وہ سالا تھا بھوندو اور دوسرا تھا کبرا اور وہ ڈائن بھنگوی جو نوپچے کی ساری آمدنی کھا گئی، وہ ملوں کے مزدور۔ بھائی ہیں بھائی ہیں، مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑگئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لئے موجود۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟ — جب جیلر نے آکر مجھے حکم سنایا ہے کہ 'تیری میعاد ختم'، تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس ایک دم سے گھر کی یاد آگئی۔ گھر! کیا چیز ہے؟

گھسیٹے کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائے گا، اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آکر گھسیٹے بھونچکا سا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اڑا رہی تھی۔ جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔ کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر برابر تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ سڑک خوب آباد تھی۔ مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آجا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھپاک چھپاک کرتی جا رہی تھی۔ غرض کہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آکر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں،

راوکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آگیا۔ تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا
راراستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبے کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر
ا ہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں
ے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم زمین پر لیٹا
ائی کی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی ہنسی چھوٹی چھوٹی
دیں جو کب کی بھول چکی تھیں۔ پچیس برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے اکدم پھڑپھڑا کر
ڑپ کر نکل آئیں اور کم سن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اچکنے کودنے لگیں۔
ہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب اس مسجد کے گرد پانی بھر جاتا اور گاؤں
بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یوں ہی کھڑا تھا اور
لیٹا مینار یوں ہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا، بفاتی، بلاقی، تینو،
بولا، سورج، ابلی اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا اور کون کون سارے کی ساری
ڑلی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر بیار مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار
مرود کا ایک باغ تھا۔ اس پر کبھی کبھی لونڈا ڈاکہ پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے ر
درچپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے۔ اور رکھوالا ماں بہن
ی سناتا دوڑا اور ادھر آتا فاتا میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے
مرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی آنکلی جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی
کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔ وہ چڑیل چڑیل چلا کر بھاگے۔ پھر کیا تھا سب سر پر
پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاقی رہ گیا۔ اسے ڈر کے مارے اس کی جو گھگھی بندھی ہے اور جو
لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے.........

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ پر ملائمت آگئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف پتا ور کے ہرے بھرے جھنڈ تھے۔ جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کم ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی میناؤں اور کوؤں کا شور کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ، باغ کے رکھوالوں کی ہو ہو، ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی جیسے پتا وروں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت، ہوا، آنے والی صدائیں اور خوشبو سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی چھینٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے بیلوں کو کندھے پر، بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آگیا۔ اس کا نشان ایک کھڑا تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام اسے ایک بہت رومان بھری انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے پاؤں تھام لئے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا۔ ودے کی جھاڑی اور گڑھیا یہیں دلاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی ج

لاری جس کے نہ رد ٹھنے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور نہ ملنے کا۔ وہاں بیٹھ کر وہ
لاری کا انتظار کرتا تھا، تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے۔ شہر جاؤں گا، نوکری
روں گا۔ دونوں وقت چنے چباؤں گا مگر روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھوں گا۔ پھر
ب ڈھائی سو روپیہ ہو جائے گا تو واپس آؤں گا اور ہیرا لال کی طرح ایک دم سے
یل کوئی بیل لے کر کھیتی شروع کروں گا۔ اسی وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں
رے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے
جایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور، اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ، گڑھیا میں ڈھیلے
پھینکے گی، گنگنائے گی۔ میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی ——
ڑی چڑیل تھی نہ جانے اب کہاں ہے ؟
گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے ؟
ل ہے تو اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی۔ کیا
رمانہ تھا !
گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی
ل دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان
سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا جیسے کوئی بسری بات اک دم یاد
گئی ہو۔ یہی جگہ تو ہے۔ ہاں یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبن میاں کی
یص کا بٹن نوچ لیا تھا۔ ادھر شبن میاں گھر کے اندر آئے اور ادھر ڈانٹ لگائی۔
گھسیٹے ! گھسیٹے ! —— کدھر مر گیا۔ ؟" ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے
نہ کی طرف بڑھا دیے۔ ان کو اتارو، پھر جرابیں اتارو، پھر انگلیوں کو تولیے سے پونچھو، پھر
وتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو —— شبن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا
تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں ! ہمارے پاس کیا تھا ؟ ایک

پھٹا کرتہ یا جامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خاں صاحبن کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔ "پھر پھاڑ لایا"؟ اس کے بدن پر تو کا۔ ہیں"۔ یہ کہاں سے کھوپچا لگایا؟" ـــــ کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی"۔ ایک بار شبن کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے۔ جھم جھم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ا مٹھی میں دبالیا۔ تھوڑی دیر میں شبن میاں چلانے لگے" ایک بٹن کیا ہوا؟ کو لے گیا؟" میں نے جی میں کہا۔ میں لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چا کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمھارے گھر کا کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر با چلا آیا۔ میری قمیص میں آستین کہاں تھی۔؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر جھم جھم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتو کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آگئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گا۔ پرانا دھرا دبکتا پھرتا تھا کہ ابا نے، جو میری کھوج میں لگے تھے، دیکھ لیا" تو شبن میاں کا کا بٹن لے آیا ـــــ سونے کا بٹن"۔ دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹ کلکتہ میں چار پیسے پتہ ملتا ہے جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپروں اور نیچی نیچی کچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی جس سے دل کو عجب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولہے جا گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے او چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لئے بھاگی جا رہی تھیں۔ دوارے پر لڑکے لڑکیاں اوتیا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں۔ ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے

ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آگئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینار سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بارات یاد آگئی۔ جو باجے گاجے لئے مشعلیں جلائے ایک کمزور سی ناؤ پر، چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے آ اُتری تھی۔

یقینا بھی آگئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کھٹیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھرڑ گھرڑ چکی پیسنا اور اس پر گاتا " موری چھاگل نہ بولے" دن کو کام کاج کر کے گھر آؤ اور لاکھ چلاؤ " اماں روٹی دے، اماں روٹی دے"! اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ۔ رو دھو کر اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولھا جلاتی جمیا اور شبراتن! افوہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی۔ اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی حرامزادی۔ کبھی جو کام کرتیں ـــــ ادھر آبا کلہاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور جھونٹے پکڑ کر دھوتیں دھومیں ـــــ واہ ری اماں جہاں کسی کا جی خراب ہوا اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے۔ ارے آ تیرا سر داب دوں " ـــــ ادھر آ بخر بجر اتاروں ـــــ چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا۔" دونوں وقت ملتے نہ چلا۔ ہر وقت ٹٹکا اتار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے ـــــ کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے۔ گلے سڑے، کھٹے میٹھے جیسے ہی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود، جھر بیریاں، کیتھے اور کیا کیا سب شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا سے

برا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اس نے طاق میں رکھ دی۔ میں ادھر سے آؤں چرا کر ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا۔ وہ لگے ڈکارنے۔ "کون کھا گیا؟" اماں سمجھ گئیں۔ سہولیت سے بولیں "چوہا کھا گیا ہوگا" ——— "تو کھا گئی ہے تو کیا چوہے بلی گڑ کھاتے ہیں۔" اماں نے کہا "کیوں؟ کیا ان میں جان نہیں ہے؟" میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تم ہی ابا چٹخارے ملیں گے "واہ کیا مجا ہے"۔ جمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔ منہ سے پانی چھوٹنے لگا۔

گھر میں اب کون ہوگا؟ ابا اماں بھلا کیا زندہ ہوں گے؟ ستر اسی برس کون جیتا ہے۔ جمیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں نقیرا تو جوان ہوگا۔ بھورے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں؟ اوہ کلو کتنا تنوں کی ناتنیں ہوں گی۔ کلو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

۲

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بنیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا ——— وہ جگہ تھی وہ ——— ہاں ——— وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا جو کھڑا تھا۔ اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف جو حد کی جگہ تھا ٹکڑوں، تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جلا ایک اژدہام تھا جن کے

پتلے پتلے ٹیڑھے میڑھے سائے کیچوؤں اور کھنکھجوروں کی طرح زمین پر بچھا رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔ اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں ـــــــ تم کو کیا کھلائیں گے؟"

یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھسیٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے پچیس برسوں کے کچلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا، اکبارگی مرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا۔ وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے، اور بار بار بکریوں کے موت کی کراہند اور نابدان کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد منڈلا رہی تھیں، ان بالوں کو ڈھا دیتیں۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک بلا رو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا، جواب نہ ملنے پر پھر کھکھارا! بار بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

"اندر چلی آؤ نا۔"

اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو سچ مچ کھکھارا، پھر کہنے لگا:

"کون فقیرا؟"

"ہاں!"

فقیرا ذرا چڑ کر بولا۔ "تم کون ہو؟"

"ذرا ادھر آؤ۔"

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا "تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"زرا سنو تو بھائی، تم فقیرا ہو نا؟"
"ہاں ــــــ کہہ تو دیا"
"تم یہیں رہتے ہو؟"

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا: "میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں ــــ تمھارے پاس۔"

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا: "تو اندر آؤ۔"

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلا وجہ ہریانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلایا۔ چھپر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بند ھے تھے۔ انھیں سے شاید گھرانے کی روٹی چلتی تھی۔ زرا ادھر ہٹ کر زمین پر ایک چھیدھا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی، اوڑھنے کے لئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دبلا پتلا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں، جیسے کچی دیوار پر بہ کھلے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی، جن میں سفید زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا: "بھیا تم تو جوانی ہی میں بڑھا گئے۔"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:
"جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے"۔
"سچ ہے بھیا ــ بھورا، جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"
اب فقیرا کھٹکا ــ" پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو ــ گھسیٹے تو نہیں ہو"۔
"ہاں گھسیٹے ہوں اور کون۔ بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آ رہا ہوں"۔
بھیا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر اسے لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے، اس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ "اب نہ رو، یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے۔ اماں کو دیکھو گے؟"
گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
"اماں ــ ہے کیا؟"
"ہاں"۔
چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا: "وہ پڑی ہے"۔
گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں اُدھر بھاگا۔
یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کے دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کر نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں سوندی کوڑیوں کی طرح بے رنگ اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کوے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آ گئی

تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا، بد گوشت ہو یا ورم ا۔ جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔ گردن اتنی سوکھی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں جیسے کھینچی ہوئی الٹی بجڑی کی خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھری سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی۔ اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منھ کی طرف بار بار لے جانے لگی۔ جیسے گونگا کھانے کو مانگے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آیا تھا۔ باب۔ باب۔ باب۔ باب ۔۔۔ باب۔"

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی، جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بندر چیختے اور رات کو سیار روتے تھے۔

فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا: جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منھ سے نکل نکل پڑتا ہے، پھر بھی مانگے جاتی ہے۔"

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا۔" اماں"۔

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔

فقیرا نے کہا۔" نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے"۔

بڑھیا کا پوپلا منھ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، باب کی آواز نکل رہی تھی، اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منھ کی طرف جا رہا تھا مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منھ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دُھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے۔ اس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا۔ زرا زرا سی چیز کے لئے کیسا کیسا ترستی رہی۔

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا پیار اُبل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اُٹھالے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا، مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دور تھی۔

فقیرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا "بھیا! تم زرا ہاتھ منھ دھولو۔ میں کھانے پینے کا کچھ سُبیتا کروں۔"

فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اُس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا اُدھار مانگ لایا اور پھر چولھا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس آبیٹھا اور بولا "اتنا آٹا؟ کیا تم نے ابھی نہیں کھایا۔؟"

"نہیں، آج آٹا ختم ہوگیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔"

"اب کھیتی نہیں ہوتی۔؟"

"وہ کب کی بند ہوگئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہوگئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک ترکاریاں ورکاریاں بوئیں مگر وہ بکیں بکا تیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔"

"بھورے کاہے میں پکڑا گیا؟"

"سونی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہوگیا۔ مگر اس کی

طرف سے کوئی کاہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا:" فقیرا! مجھ سے تو اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائے گا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن، عیش تو کر لیں گے ـــ دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا۔ بانکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔"

" جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

جمیا حرام زادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہو گیا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے کسی طرح گذر بسر ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا:
" تمھارے جانے کے بعد بھیا وہ آئیں بائیں سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا زمانا تھا، آبا کہا کرتے تھے کہ" یہ سب پلے پیٹ بھرے میں پیٹ بھرے"۔ سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گذری، جب چولھا نہ جلا ہو۔"

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا اور لپٹے کوئلوں کی طرف تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا۔" کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟"

ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گذری وہاں، ملوں کی خاک چھانی، امیدواری میں کام کیا، بھوت نگر میں روئی ڈھوئی، ہفتوں قبض رہتا تھا، چار سال رکشا چلائی، پھر خوانچہ لگایا۔ ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسہ ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے دیسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روئے رلائی نہیں

آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

فقیرا بولا: "بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ، اماں سن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر سونے دے گی۔"

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا: "تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی!"

"ہاں، مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سن لیتی ہے اور کھاتے کے بھی پالیتی ہے، اور پھر باب باب کرنے لگتی ہے۔"

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرح تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منہ کا لا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

(۳)

گھسیٹے گھر کے دروازے ہونٹوں پر بکری کا مسکا ملے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا، اپنے میلے کرتے کے چیلوے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں، پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سیکڑوں میل کا گرد غبار بھرا ہوا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت کی چوٹی کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑپھڑاتے تھے جیسے اسے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی دروں کو بدن پر سمیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے سُو سُو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے

دوسرے ہی دن وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپر بکریوں کے مُوت کی کھراہند ا
ماں کی بابا' باپ سے گھبراگیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چراتا اور را
بڑے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی
بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کچھ یا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک ا
بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں
ہر چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتوں میں
اور کھچاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانے دار کی طرح اکڑتا دکھاتا ہے او
وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کم
کوئی راستہ نہیں' دمڑی دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دس
رہنا۔

گھسیٹے بیلوں مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکانوں
تختوں پر رات کاٹنا' وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سلی اور گرمیوں میں
ہوا تھا ہوتی تھیں' خچر کی طرح رکشا لے کر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین فاقے کر
اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی سنگل چا
دھیلے والا پان کا بیڑا! وہ پیسے کی پچیس بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے
وہ یہاں ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے مٹر کے کھیا
کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک
کے جھانوں کی مار کھائی۔ کھانے پینے کو ترستے رہے' پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کو
شہر بھاگے' وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں' کہا چلو کلکتہ چلو' وہاں پہنچتے ہی ا
نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا' کلکتہ گئے پچیس برس! اوہ! کوئی ک

ٹھا نہیں رکھی، رکشا تک چلائی، سیٹھ جی نے کہا اک گاڑی لینا ہے تو جمانتی لاؤ۔ یں کیسے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ جمانتی لے آتے تھے۔ لچھمن بولا۔ دو آنے روز دو تو کلوٹا مہاجن جمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے روز اسے دیے، پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ سے دور ہی سے دیکھ کر لوگ دور ہٹ جاتے تھے۔ جب سیٹھ سے خوشامد کر کے ایک چھی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی پھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑے مگر رہے وہی موچی کے موچی۔ بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے۔ اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض اُدھار کر کے پان سگریٹ، دیا سلائی کا خوانچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا سیزر لاؤ، یہی کٹ لاؤ۔ یہ لاؤ وہ لاؤ۔ یہاں کیا تھا! کہتے "نہیں ہے صاحب، نہیں ہے۔ مجبوری۔" وہ بھی تماشا کچھ دنوں رہا، نہ بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا اس پر جو کچھ بھی آیا حرام زادی بھنگولی کھا گئی۔ نہ جانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی ——— لنگوٹی میں پھاگ ———

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کڑے پن سے بولا ــ "پھر تم نے چرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمھارا گذر نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا ہو چلے جاؤ۔"

گھسیٹے نے جواب دیا۔ "کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا ہی قصہ، روز کا ہی قصہ۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں۔"

"گھر میں حصہ، بکریوں میں حصہ، تو حصہ بٹائے گا؟ کام کا نہ کاج کا، دشمن

اناج کا۔ پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے، گیا تھا روپیہ کمانے
گھسیٹے گرم ہو کر بولا۔ کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؛ تو خود تو زندگی بھر
تعصبے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے
جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لئے تکڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس
روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ ہے"
فقیرا نے طعن سے کہا:" ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپئے ڈھیر تو لے کر
جاتے ہی ہیں۔ بلّی جو اتنا روپیہ لایا ہے تو کیسے لایا ہے؟"
اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سُن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں
رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سُن سکتا تھا۔ وہ چلا کر بولا:
" اور تو نے کیا کر لیا ہے چوٹّا کہیں کا۔ ان بکریوں میں، اس گھر میں کیا میرا
حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب تنہا کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے۔ میں آج ہی اس منحوس
گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا......"
گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔
کیا کرے جو فقیرا کو یقین دلادے کہ ہفتے میں میں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی
کچھ یوں ہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔
تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔
یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے ہو رہا تھا۔ روز
جھگڑا اُٹھتا۔ روز ہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جا
رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو
ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب میں
کے لئے اس اجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کا

ک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آجاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی
تما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا
ر ہو، دوارے بھینس بندھی ہو، کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو جو
اری کے پلو سے تھالی صاف کرے، اس میں دال بھات لاکر سامنے رکھ دے،
س کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف
کے ہوں جیسے شرمائی سالی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک لگ
پتر ہو، دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔
ب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان۔ چالیس کا سن ہونے
د آیا ——

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی کہ اب دو چار برس جوانی
رہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آجائے۔

ایک زبردست امنگ اٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی
ر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا۔ "بھیا فقیرا۔!"

فقیرا پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آگیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا
ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا: "میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔
ر کوئی کام بھی تو ایسا ہو کہ جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے
بیس برس بھاڑ جھونکا، مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں
۔ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگاؤں، یہ کروں وہ کروں،
یں کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار
ا سکتا ہے۔؟"

گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات نہیں ہوئی پھر فقیرا

کی طرف دیکھ کر بولا: "اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح۔ جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں ——— وہ تو تم مانتے ہی نہیں ——— اس میں تمھارا بھی بھلا، ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جوگیوں کو دیکھو ان کے گھر ہُن برس رہا ہے ہُن کہنے کو ہم شریف اور وہ رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگلو سیر بھر آٹا اُدھار دے دو، دو کنکڑیاں نمک دے دو، ذرا سی تمباکو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں، دھتکار بھی دیتے ہیں، مگر ہم پھر جاتے ہیں نہ جائیں تو کریں کیا؟"

نفیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا، گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا: "اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے۔"

گھسیٹے نے اکدم سے کچھ یاد کرکے نفیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا:

"ہاں تمھارا شادی بیاہ کرنا ہے۔ روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں سہی۔ ارے ہاں اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے اور پھر یہ اماں کے لئے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔"

نفیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا، مگر تب انھیں سُن کر نفیرا کو غصہ آ گیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے۔؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا۔ اور شرافت وہ دھن۔ جو پیڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا ہے۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی

ین سوند جائے، جب بھی مانجھو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر
مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ ہے پیسہ ہے، گھر گرہستی ہے،
ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے، ہم ہی ان سے روٹی ادھار مانگتے
وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ہم
، کھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔
فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے
ے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور
ٹے روپیہ کا گھڑا لے کر نہیں لوٹا، اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو
ں پیسہ ملتا ہے۔ پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس
ہے کہ اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی، دل لگی کر لو، اور کیا
ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب
یٹے روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھتے، آس
ے کا یہ منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس
انگڑائی لے کر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کی کوئی
تھی، آج جو مایا کے مندر کی راہ سوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے،
چھپر بدل جاتا، تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور ذرا چار پانچ روپے اکٹھے
تے تو پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا، وہ
تی کی بیوہ، آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے۔ اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے،
گدرایا بدن ہے۔ جیسے پکا آم۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے
دودھ دوہے، اوپلے تھاپے، وہی وہ تھے، اکیلی جھونوں پانسر اٹھا اٹھا
توں میں وہ ڈالے، کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھا لے گا

پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے، وہ رمضان کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکبارگی پیچھے سے آگئی۔ آ بھاگتے نہ بنی، کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی، پھر وہی جس کا فقیرا کو ڈر تھا یعنی اسی دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

(۴)

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی روشنی میں اٹھے اور ایک ٹوکرے کو بانس سے اٹکا کر ایک ڈولی سی بنالی اور اس میں خوب حاپیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں ایک کمر میں ڈال کر اس کو جیسے بچی کی طرح اٹھا لیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی باب باب، باب کر کے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا تھا اسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اس کا چہرہ عجیب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں آنسو آرہے تھے اور دوسری طرف بدن کے رو ئیں کھڑے ہو گئے تھے۔

گھسیٹے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشے کا برتن ہو، ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں میں چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہو۔

گاؤں کے نکڑ پر آگئے تو پَو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا: "کہاں چلے فقیرا؟"
ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اٹھا: "شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں ۔ ے وہاں جا رہے ہیں۔"
"اماں کو لئے۔" کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا۔
"شاباش تم لوگوں کو ____ بڑی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!"

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا، اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر، ایک گلی میں آکر ڈولی رکھی۔ گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی، اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باب باب کرتے وقت کہیں ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر احتیاط فضول تھی کیونکہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگے۔ اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔
بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رت جگے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ ہلا چلائے اور کھانا مانگے، جیسے بٹھائی گئی تھی ویسی ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بُری رہی۔ ساری کی کرائی پہ پانی پھرا جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔ اس نے تھال پر چپٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی

مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اُسے انگلی سے پونچھ پانچھ کر ایک پتہ پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اس نے لا کر فقیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً ہاب ہاب کر کے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آ گئی۔ گھسیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پر بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا، عقل چندھیا گئی تھی اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آ گئی تھی۔ گھسیٹے مشاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا نوسکھئے کی طرح، جو پانی دیکھ دیکھ کر سہما جاتا ہے، گھسیٹے فقیرے کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی بھنمنہ، ذرا اونچی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں، چندھے چیڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے، جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے، پھیکے، بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوؤں کا جنگل اور بدن پر میل کی کھنگل، چیتھڑے، ٹھیکرے، میل، آخور، بلغم، ناک، پیپ، مکھیاں، جراثیم، فریب، جھوٹ، اور ان سب کو ڈھانک دینے والی، لوریاں دے دے کر، تھپک تھپک کر سلا دینے والی مہا پاپن بے حسی۔!

— اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا لے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ میل کچیل ہو، چاہے ذلت ہو، حیوانیت ہو، چاہے انسانیت ہو، مایا کے مندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔

صاف اور سیدھا راستہ، تنہا راستہ، پھوٹی آنکھ کا دیدہ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا:

"ابے ادھر کہاں آیا؟ بھاگ یہاں سے!"

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ نقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سنا کر کہا: "تمھارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو، ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سنتے ہی فقیر تو زرا زرا بڑ بڑا کر چپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا، ان کو ڈانٹا: "چپ رہو بدنصیبو نماز ہو رہی ہے۔"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے، کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے نقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی ٹیرا چٹا دیا۔ ٹیرا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا، گود میں سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لئے ادھر سے گذر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار

سر سے پاؤں تک کانپ گئی! جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے تر نوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اسی میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا، دے گا بڑھیا کو! اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہیے جس پر آکر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں بابا! بھوکا ہوں بابا! ایک فقیرنی گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگانے لگا "جیب دے گا اللہ ہی دے گا!" فقیرا بھیڑ بھاڑ، دھکم دھکا اور شور ہنگامے سے ایسا بھونچکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور شیرا چٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پتہ چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کا لگنا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی میں اس کے منہ سے نکلا "اللہ ہر آفت سے بچائے" اس صدا کو اس طرح دینے لگا، جیسے کوئی والنٹیر "انقلاب زندہ باد" کہے، کیونکہ دوسری لے اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے تھے، دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ درد انگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا تو خالی

ہاتھ یا ایک ایک دو دو پیسے لئے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا۔ اور خوب کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان، اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامنے ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک — اماں زندگی بھر کوشش کرمریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں — جیلے روزی بہانے موت۔

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور نفیرا ڈولی لئے شہر کے باہر ایک تنہا ہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے، تکان سے چور چور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے، گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔
ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے، دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر

ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں بہت سی تیل کی پوریاں، کئی قسم کی ترکاریاں، سیر بھر تپک ببل مٹھائی، چٹ پٹے کباب، مولیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پورے دو روپے ملے تھے۔ جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھیسٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھیسٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے پھر مربھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے۔ گویا زندگی بھر کی بھوک۔ اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی، ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر جلدی سے دوزخ میں اتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھیسٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

”لو آج تم بھی مزے دار چیزیں کھا لو۔ کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی۔“

گھیسٹے نے کچھ نکتیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح بالکل پیروں کو بالکل ٹیک کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منہ میں بھر لے۔ نقیرا اور گھیسٹے کے لئے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل مانگنے لگتی ——— گھیسٹے جھلا کر بولا ——— ”لو تم بھی کیا یاد کرو گی۔“

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دے دیا۔ بڑھیا

فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی مگر چبتا کیا وہ بار بار منہ سے نکل آتا اور پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل لیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جُٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اُسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ کر اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلّا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلّے کی پکڑ بے تکی تھی، وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلّا دب رہا تھا۔ اس کا شیرا ٹھوڑی باچھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں میں بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیزی ہوتا گیا۔ آخر جب گھسیٹے اور نقیرا میں ٹھنسنے کی بالکل سکت نہ رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا، اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

نقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر نیا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پتا چولھا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلّہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی

کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم و سرخا سُرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں (گھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آگئی ہے۔) ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے ـــــ فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی کامیابی سی کامیابی! پونے دو روپے اور صرف ایک دن میں! پچاس روپیہ مہینہ! افوہ! اگر ہم کہیں کلکتے میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! سنگل چائے، بیڑیاں، تاڑی خانہ، بُھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گود میں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ سب بکریاں اپنی کر لی ہیں۔ حصہ مانگا تو سسرا اکڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا ـــــ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر دے دوں گا، بکریاں دے دوں گا، مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا ـــــ حرامی سالا فقیرا!"

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا "فقیرا سونا بعد کو پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چُک جانا چاہیے۔"

"کاہے کا حصہ بانٹ؟"

"ہاں اب تو کہو گے کاہے کا حصہ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو کمایا ہے اُس کا

فقیرا تلملا کر اُٹھ بیٹھا۔

"پھر وہی گھر، پھر وہی بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابا کا بنایا ہوا چھپر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنوایا ہے۔ اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں چلا ہے حصہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے؟"

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصّے میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا: "اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لیجاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے۔"

"ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو مُوت صاف کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی۔ اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو اماں تیری ہے۔ تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری تو لے جائے؟"

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصّے میں ماں کی طرف لپکا۔ جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا۔ مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارہ حد سے اونچا ہو گیا۔ اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا وہ کوئی گٹھری ہے۔ جس طرح بلّی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلّی کی طرح جس کا بچّہ مر گیا ہو عوعو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ تڑ سے کھڑے قد پیچھے گر پڑا۔ اور بڑھیا چیختی، قلا بازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے

نقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منھ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈھیلے غلوں کی طرح باہر نکل آئے، منھ بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں بر رگئے۔ اب گھسیٹے کا غصہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بیجا کی طرح ہونق ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لیے۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصے یہ دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کسے پروا ہوتی ہے۔ مر گیا —— مر گیا —— ہا —— فقیرا —— ناحق مرا۔ مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا برا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے۔ اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں —میں بھی تو کچھ دنوں زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا، جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو —— پیاری اماں —— کلکتہ، وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا، دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ، مسی ہوئی چوتھ کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ منھ کلھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ نکتیاں، گلاب جامن، پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے۔ لونڈے کے لونڈے۔ زرد زرد پھین۔ گھسیٹے

ڑھ کر ہاتھ لگایا ــــــ بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونا بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا۔ پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ
دل میل سے درختوں کو تاراج کرتے مردہ پتیوں کو اٹھا اٹھا کر پٹکتے۔ وحشت ناک سُروں میں سائیں سائیں
ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑا کر
ائیں گے۔ گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری
، ماں کی۔ دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک
زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔
ہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی
ن کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی
ی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا کا رشتہ
وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چکی ہے پیشہ مل گیا ہے اور
، کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آ گیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے
، نہیں بنا تھا ــــــ امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی انتھاہ مصیبتیں
نی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک
رمنھ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔
گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

مُمتاز مُفتی

آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوریں دیا آجاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو یہی چھ سات سال ہو گا۔ کہنے لگا "امی جان! میں بھی باہ کروں گا۔"

"اوہ! ابھی سے!" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں ۔۔

"اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟"

"اونہوں!" بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں "کیوں آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھاجو باجی سے باہ کریں گے۔" بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا
اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں "کیوں دیکھو

اچھی ہیں۔"

"میں بتاؤں کیسی ہیں؟" وہ چلایا

"ہاں بتاؤ تو بھلا" اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھاکر چاروں طرف
جیسے کچھ ڈھونڈھ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولھے پر آکر رُکی۔ چولھے پر
ے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف طرف اشارہ کیا اور بولا۔
یسی!" پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھاکر چیخنے لگا۔" اور چھابو باجی ایسی!
، بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے۔ اتنے میں تصدق بھائی آگئے۔ اماں کہنے لگیں۔
صدق بدو سے پوچھنا تو آپا کیسی ہیں؟" آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا
نہ موڑکر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا بدو؟" وہ بولے "بتاؤں؟" بدو چلایا اور اس نے اپنے
ٹکڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا
ہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور رنگلی ہلاتے ہوئے بولی۔" اونہہ!" بدو
نے لگا تو اماں کہنے لگیں "بچّے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے، اس میں چنگاری ہے۔"
_____ "وہ تو جلا ہوا ہے اماں!" بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں۔
رے لال تمھیں معلوم نہیں اس کے اندر تو آگ ہے، اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔"
و نے بھولے پن سے پوچھا "کیوں آپا اس میں آگ ہے؟" اس وقت آپا کے منہ
ہلکی سی سرخی دوڑ گئی "میں کیا جانوں" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پکنکی
ٹھاکر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگیں۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھیں اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق
یں کہ بات اُبھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی
ریں کہا کرتی تھی "آپا تم تو بس بیٹھی رہتی ہو۔" اور وہ مسکرا کر کہتی "پگلی!" اور

اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی ا
نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑتے۔ ادھر بد
"آپا میرا دلیا" اُدھر آپا گھورتے " سجادہ ابھی تک چلائے کیوں نہیں بنی"؟ بیچ
اماں بول اٹھتیں " بیٹا، دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے"؟ اور آپا چپ چاپ
کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں ا
کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا
کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے ادھ
گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں
اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ زیاد
زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی۔ اور بس۔ البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی۔ جب وہ
تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں میں تو سمجھتی تھی
جیسے ہی بیٹھی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہلتی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہا
جاتی ہے۔ جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے سے چلتی
جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے
کرتے میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی
اسی طرح گردن موڑ کر مدھم آواز میں کہے۔ "ہیں جی! کیوں جی؟ اور اس کی آ
آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگے۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی۔
ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ا
قہقہوں سے گونجتا رہتا تھا۔ جیسے مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا
کہ انھیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک میٹھ رہنے والی
ایک "یہ کرو وہ کرو" والی اماں اور دن بھر حقے میں گڑگڑ کرنے والے ابا!!

اُس روز میں نے ابّا کو امّی کہتے ہوئے سُنا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بے حد غصّہ آیا۔ ابّا کہنے لگے "سجادہ کی ماں، معلوم ہوتا ہے سائرہ کے گھر میں بہت برتن ہیں۔"

"کیوں؟" امّاں پوچھنے لگیں۔

"کہنے لگے" بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔"

امّاں تنک کر بولیں "مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھروں کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابّا کہنے لگے "اُفوہ! میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔" میں نے ابّا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ جی ہاں! اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کو مُنہ چڑاؤں۔ اس بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا۔ اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ "ابّا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقّہ لیا اور گڑگڑ کر لیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرنے لگے۔ جیسے کوئی بھٹیاری مکئی کے دانے بھون رہی ہو۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دل چسپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اور جب ابّا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھاری آواز میں گایا بھی کرتے۔ جانے وہ کون سا شعر تھا۔۔۔ ہاں ؎

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انھیں گاتا سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو بدو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی "بدو رو نا!" اور پھر آپ ہی آپ بیٹھی مسکرا دیتی۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے، بھائی تھے۔ انھیں ہمارے گھر آئے یہی دو ماہ ہوتے ہوں گے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی۔ بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو یہ عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے۔ جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ سا بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے معروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے۔

" بدو تمھاری آپا کیا کر رہی ہے؟"

" آپا" بدو لاپروائی سے دہراتا "بیٹھی ہے۔ بلاؤں؟"

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے "نہیں نہیں۔ اچھا بدو، آج تمھیں، یہ دیکھو اس طرف تمھیں دکھائیں۔

اور جب بدو کا دھیان ادھر ادھر ہو جاتا تو وہ مدھم آواز میں کہتے۔

" ارے یار تم تو مفت کے ڈھنڈورا ہو۔"

بدو چیخ اٹھتا۔ "کیا ہوں میں؟" اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ "ڈگمگ ڈگمگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے، دیکھا؟"

جیسے ڈھول بھی کہتے ہیں ڈگمگ ڈگمگ سمجھے؟ اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر ٹھہر جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولھے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا، بالوں کی لٹ پھسل کر گال پر آ گرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھوں میں چولھے ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتی۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو وہ ٹھٹھک کر یوں اپنا دوپٹہ، بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بے گانہ آ گھسا ہو۔

ایک دن میں آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی صاحب اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بھائی صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے "میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے، کتابیں پڑھ سکے، شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ڈز ڈز، ڈز اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکے سمجھے؟"

بدو بولا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

"اونہہ!" بھائی صاحب نے کہا۔

بدو چیخنے لگا۔ "میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے۔" "ہاں!" اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا۔ مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔

"واہ! تمھاری آپا فیرنی پکاتی ہے تو اس میں پوری طرح شکر نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ سچ تو!"

بدو نے کہا۔ "ابا جو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہئے۔"

" تو وہ اپنے ابا کے لئے پکالی ہے نا۔ ہمارے لئے تو نہیں۔"

" میں کہوں آپا سے"؟ بدو چیخا۔

بھائی چلائے "یہ ادبلا۔ ڈھنڈورا۔ لو تمھیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ دیکھو اس طرح ڈگمگ ڈگمگ۔ بدو پھر چلانے لگا" میں جانتا ہوں تم میز بجا رہے ہو نا۔
——— ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا۔ بھائی صاحب کہہ رہے تھے ———
" کشتیوں میں، اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے۔ آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاما اور تم بدو پہلوان۔ لو آؤ ——— ٹھہرو ——— جب میں تین کہوں"۔ اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے مدھم آواز میں کہا۔" ارے یار تمھاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی۔ اس لئے وہ اُٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے مُنہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے۔ کہنے لگے۔" کیا پڑھ رہی ہو جہینا؟" ان کے مُنہ سے جہینا سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے ایسے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہاں کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی مُنہ میں باسی روٹی کا مزا آنے لگتا ہے۔ میں تو نور جہاں سن کر یوں محسوس کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوارنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے مُنہ سے جہینا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے مگر وہ تو پرانی بات تھی، جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔

خیر میں نے جواب دے دیا "اسکول کا کام کر رہی ہوں۔"
پوچھنے لگے "تم نے کوئی برنرڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"
میں نے کہا "نہیں!"
انھوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمھاری آپا نے ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہو گی۔" وہ کنکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔
آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم آواز میں کہا "نہیں!" اور سویٹر بننے میں لگی رہی۔
بھائی جان بولے "کیا بتاؤں جہینا کہ وہ کیا چیز ہے نشہ ہے نشہ، خالص شہد، تم اسے ضرور پڑھو بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔"
میں نے کہا "ضرور پڑھوں گی۔"
پھر پوچھنے لگے "میں کہتا ہوں تمھاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا کیوں چھوڑ دیا۔؟"
میں نے چڑ کر کہا "مجھے کیا معلوم آپ خود ہی پوچھ لیجیے۔" حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ کہتی تھی میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درس گاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو۔ مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی میں جانتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھے رہنے کے لئے کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی تھی نکتہ چین۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلیفون تھی؟ خود آپا سے پوچھ لیتے۔ آپا بیٹھی

ہوئی گم سم آپا۔ بھیگی بلی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھتے ہوئے چلا اٹھے: "آج فرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ سجادہ! سجادہ بیٹی! کیا کھانڈ اتنی سستی ہوگئی ہے ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ مگر اس وقت اس کے گال تمتما رہے تھے کہنے لگی "شاید زیادہ پڑ گئی ہو۔" یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید ——— کیا خوب ——— شاید۔"

ادھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے۔ صحن سے اماں دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں، جیسے ان کی عادت ہے۔ "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں۔؟ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے اس کا تو خیال رکھنا چاہئے ——" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ کہنے لگے "اوہ یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں ——— اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا اس سے ملنا تو کیا بات کرنا تک پسند نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کرکے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلہ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے ایک دو باتوں سے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی: "ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپا لوٹ چکی تو کچھ دیر کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر

جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا۔ "آج آپا آئی تھی!"
ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہیں۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا۔ ہاں۔ ہارٹ بریک ہاؤس!"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفّل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا۔ رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کرکے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدّت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا۔ "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے؟ دل توڑنے والا گھر؟ اس کے کیا معنی ہوئے؟" آپا پہلے تو ٹھٹھک گئی۔ پھر وہ سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔ "اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔"
کہنے لگی۔ "میں کیا جانوں؟"
میں نے اسے جلانے کو کہا۔ "ہاں! ہماری آپا بھلا کیا جانے؟ میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسے بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔
ایک دن یونہی پھرتے پھراتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر پوچھنے لگے۔ "جھینا اچھا یہ تو بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں کیا جانوں جا کے آپا سے پوچھ لیجیے۔"
ہنس کر کہنے لگے۔ "کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟"

"کیوں میں لڑکا کا ہوں؟" میں نے کہا۔

بولے "نہیں، ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن لڑکا ہو جاؤ۔"

اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے "دیکھو چھینا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے، ذرا نہ اکتائے۔" جانے کیوں میں گھبرا گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا "فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان؟"

بولے "وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید، لال لال، کالا کالا، نیلا نیلا سا۔"

میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی، پھر کہنے لگے "وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ بھابی جی چھینا ہم نرنی کھا کر اکتا گئے۔"

میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی، کیونکہ اس شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "نعمت خانہ" پڑھ رہی تھی۔ اس دن کے بعد روز بلا ناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے کہا۔ "بدو، بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟"

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا "بدو جاؤ تو بھائی جان سے پوچھو اس کھانے کا کیا نام ہے؟"——

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف اٹھ کر جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے کیوں گھورا تھا؟ اور اس رات کو آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پر بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں۔ مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہی دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے،

بٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہری۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر
ں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساجو اور ثریا چارپائیوں
ر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چھاجو باجی، چھاجو باجی چیختا پھرتا اور
ہتا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے باہ کریں گے۔"
باجی کہتی۔ "شکل تو دیکھو اپنی، پہلے منہ دھو آؤ۔" پھر وہ بھائی صاحب کی طرف
وں گردن موڑتی کر کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے اور وہ پنجم تان میں
چیختی۔ "ہے نا بھئی جاآن کیوں جی۔"
باجی کے منہ سے "بھئی جاآن" کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی
سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا "بھائی صاحب" کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا۔ گویا وہ
اقعی وہ انھیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر "صاحب" جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو، مگر
جی "صاحب" کی جگہ "جاآن" کہہ کر اس سادے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جاآن"
کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انھیں بھائی کہہ رہی ہے۔
س کے علاوہ "بھئی جاآن" کہہ کر وہ اپنی کالی کالی چمک دار آنکھوں سے دیکھتیں اور آنکھوں
ہی آنکھوں میں مسکراتی تو سننے والے کو قطعی یہ محسوس نہ ہوتا کہ اسے "بھائی" کہا گیا
ہے۔ آپا کے "بھائی صاحب" اور باجی کے "بھئی جاآن" میں کتنا فرق تھا۔
باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھنا بالکل بیٹھ رہنا ہی رہ گیا۔ بدو نے بھائی جان سے
کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج
کبھی کیرم کھیلتی۔
باجی کہتی۔ "بھئی جاآن ایک بورڈ لگے گا۔" یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں
بدو سے کہتے۔ "کیوں میاں بدو کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟" باجی بول
اٹھتی "آپا سے پوچھیے۔" بھائی جان کہتے۔ "اور تم؟" باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی،

یہ چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی، بھویں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی پھر کہتی" اونہ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے۔ بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے" کل جو پٹی تھیں بھول گئی کیا"؟ وہ جواب دیتی" میں نے کہا۔ چلو بھئی جا آن کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی مجھ سے ہار گئے" اور پھر یوں ہنستی جیسے گھونگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولھے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھا جو باجی، چھا جو باجی کہتا ہوا باجی کے دوپٹے کا پلّو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی" بھئی جا آن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انھیں جو خوش رکھنا ہوا ہے نا بھئی جا آن"۔ ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی اور آپا پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔" لیجئے بھئی جا آن"! اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا۔" آپ بھی کیا کہیں گے کہ سا جو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں"۔

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا" خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے۔ کس نے بنایا ہے؟ سا جو باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا" سا جو باجی نے اور کس نے بھئی جا آن کے لئے"۔ بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلایا" میں بتاؤں بھائی جان"؟ ــــ آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا۔ پھر جانے انھیں کیا ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں، جانے کیوں میں نے محسوس

جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں باہر چلی آئی۔ باہر آپا انگنی
قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکلیا۔
ر باجی کی آواز آئی۔ "چھوڑیئے چھوڑیئے"۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے
تھے۔ بدو بھی کہیں ادھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں
لی گئی، کہنے لگی۔ "آج ایک دھندناتا بورڈ کرد کھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟" بھائی جان
بولے۔ "واہ یہاں سے کک لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو"۔ غالباً انہوں نے باجی کی طرف
دورسے پیر چلایا ہوگا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی۔ "واہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے
ہیں!" بھائی جان معاً بول اٹھے۔ "تو کیا ہاتھ سے ——" "چپ خاموش"۔ باجی چیخی۔
اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا۔ "آپا اندر بھائی جان باجی سے کشتی
لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمھیں۔ چلو بھی"۔ وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ
ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا۔
"اماں کہاں ہے؟" اور وہ اماں کے پاس جانے کے لئے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھالیا۔
"آؤ تمھیں مٹھائی دوں"۔ بدو بسورنے لگا۔ آپا بولیں۔ "آؤ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی
ہے میرے پاس"۔ اور اُسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس
پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے مگر آپا
باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد
کی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر

جلنے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چاپ رہتے۔ ایک شام آماں کے علاوہ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے "بدو ساجو باجی سے بیاہ کرو گے"؟

"اونہہ"! بدو نے کہا۔ "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں"۔

میں نے پوچھا "بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا "ہم تو جھاجو باجی سے بیاہ کریں گے"۔ اماں نے پوچھا "آپا سے کیوں نہیں"؟ تو کہنے لگا "بتاؤں آپا کیسی ہیں"؟ پھر چولھے میں جلے ہوئے اُپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "ایسی"۔ "اور جھاجو" میں نے بدو کی طرح بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "ایسی"۔ عین اس وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ "ہاں ہے"! بھائی جان نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لئے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے "نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا۔ جلتی بجھتی ہی رہتی ہے"۔ آپا چپ چاپ بیٹھی چولھے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا "اُف کتنی سردی ہے"۔ پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولھے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے "مامی سچ کہتی تھیں۔ ان جلے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے؟" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوندیں پڑی ہوں۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے۔ "اب تو اس چنگاری کو نہ بجھاؤ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے"۔

○

اے حمید

منزل منزل

راجدہ نے کہا تھا میرے متعلق افسانہ مت لکھنا۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔ اس بات کو آج تیسرا سال ہے۔ اور میں نے راجدہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور نہ ہی کبھی لکھوں گا۔ اگرچہ وہ زمانہ جو میں نے اس کی محبت میں بسر کیا۔ میری زندگی کا سنہری زمانہ تھا۔ اور اس کا خیال مجھے ایک ایسے باغ کی یاد دلاتا ہے۔ جہاں سدا بہار درختوں کی پُرسکون چھاؤں میں سچے گلاب کے پھولوں کے جھاڑ مسکرا رہے ہوں۔ اور جس کی کھلی اور آزاد روشوں پر خوشحال لوگ محوِ خرام ہوں۔ پھر بھی میں اس باغ کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔ خواہ اس میں راجدہ کی بدنامی ہو یا نیک نامی۔ جب سے راجدہ جدا ہوئی ہے میں نے اس گلاب کے پھولوں اور کھلی روشوں والے باغ کے دروازے بند کر دیئے ہیں اور راجدہ کو مجھ سے جدا ہوئے آج تیسرا سال ہے۔

اس عرصہ میں راجدہ کو میں نے ایک پل کے لئے بھی نہیں دیکھا۔ اور شاید اس نے بھی مجھے نہ دیکھا ہو۔ ہم ـــــــ جو ایک دوسرے کی پل بھر کی جدائی برداشت

نہیں کر سکتے تھے۔ زندگی کے تین سال ایک دوسرے سے جدا رہ کر چپ چاپ بسر کر گئے ہیں۔ ان تین سالوں پر سے گزر کر پیچھے کی طرف جاتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں جھڑے ہوئے پتوں والی ایک پژمردہ سڑک پر چل رہا ہوں۔ جو قبرستان میں سے ہو کر گزرتی ہے۔

ان دنوں میں لاہور کے ایک اخبار کے دفتر میں ملازم تھا۔ گھر چونکہ امرتسر میں تھا لہٰذا شام کی گاڑی سے واپس اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ اگرچہ لاہور میں بڑی آپا کا گھر تھا۔ اور وہ لوگ میری اس ہر صبح سفر، ہر شام سفر ایسی زندگی پر مجھے اکثر "پالتو کلرک" کہا کرتے تھے۔ تاہم جو مزا اپنے گھر میں تھا وہ نہ بلخ میں تھا نہ بخارے میں ـــــ علاوہ ازیں کہ میری عادت کہ میں امرتسری انگریزوں کی طرح سال میں چھ مہینے کام کرتا ہوں۔ اور باقی چھ مہینے گھر بیٹھ کر ان دنوں کی کمائی کھاتا ہوں ـــــ ان اطوار کے پیشِ نظر اپنا گھر چھوڑنا عین حماقت تھی۔

لیکن راجدہ سے ملنے کے بعد میں نے امرتسر تقریباً چھوڑ دیا۔ آج سے تین سال پہلے موسم گرما کی وہ ایک گرم اور چمکیلی شام تھی۔ میں ابھی ابھی گاڑی سے اُترا تھا۔ مجھے حسب معمول بھوک لگ رہی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا۔ پُرشور بازاروں اور دھندلی گلیوں میں سے گزرتا میں گھر کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ابھی میں گھر کی سیڑھیوں میں ہی تھا کہ مجھے اوپر بھانجی کی آواز سنائی دی۔ بھانجی اور میں ہم عمر تھے۔ اور ایک ساتھ کھیلے اور بڑھے ہوئے تھے۔ وہ کافی دنوں کے بعد اپنی نانی کے گھر آئی تھی (اور میں) اس سے بڑے آرام سے ملنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ کپڑے اتارے، ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور کپڑے بدلنے لگا۔ بھانجی چھوٹے بھائی سے کسی نئی فلم کی ہیروئن کے بارے میں گرما گرم بحث کر رہی تھی اس کے خیال میں ہیروئن ہیرو سے زیادہ خوب صورت تھی۔ مگر چھوٹا بھائی کہتا تھا

کہ ہیروئن کی آنکھیں بھینگی ہونے کے علاوہ اس کے مونچھیں بھی تھیں۔ اس لئے وہ کسی طرح بھی خوب صورت نہیں کہلائی جا سکتی ——

کپڑے بدل کر میں صحن میں آگیا۔ بھابی مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑی۔ میں بھی تقریباً اچھل پڑا۔ سب قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ وہاں شور مچ گیا جس میں میرے اور بھابی کے قہقہوں کی آواز نمایاں تھی۔ یونہی میری نظر چق کے پیچھے صحن کے دوسرے آدھے حصے پر پڑی، وہاں بھابی کی نند عظمی بیٹھی ہمارے قہقہوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔

" تو گویا آپ بھی ہیں ؟"

اور میں چق اٹھا کر تیزی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ عظمی کے ساتھ ایک اور لڑکی بیٹھی تھی جسے میں نے بالکل نہ دیکھا اور جس نے مجھے دیکھ کر منہ جلدی سے دوسری طرف پھیر لیا۔ میں ذرا ٹھٹک گیا۔ اتنے میں بھابی بھی آگئی اور اس لڑکی کو مجھ سے پردا کرتے دیکھ کر بول اٹھی۔

" حد ہو گئی۔ بھلا ماموں سے کیا پردا ؟"

" ہاں بھئی، بھلا یہ بھی کوئی پردے کا موقعہ ہے" عظمی نے اس لڑکی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں وہ لڑکی شرم سے سکڑی جا رہی تھی۔ اور اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں عظمی اور بھابی سے باتیں کر رہا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے میں نے دو تین بار نظریں بچا کر اس لڑکی کو دیکھا۔ باریک ہونٹ ستواں ناک، جھالریں اور پلکیں اور ہلکا گلابی رنگ۔ چپ چاپ بے زبان جیسے موم بتی —— یہ تھی راجدہ۔

اس سے پہلے میں نے راجدہ کو کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ بھابی نے بتایا وہ عظمی کے سسرال سے ہے۔ اور میں نے سوچا اگر وہ عظمی کے سسرال سے نہ ہوتی

تو مجھے کہاں ملتی ؟ ویسے زاہدہ کا مجھ سے ملنا ناگزیر تھا۔ یہ میں اب سوچتا ہوں۔ شام کے کھانے کے بعد سیر کا پروگرام بن گیا۔ اور ہم سب کمپنی باغ کی طرف چل پڑے۔

باغ ابھی فاصلے پر تھا کہ شام کے ٹھنڈے سائے ماند پڑ گئے۔ اور مرطوب ہوا کے نیم جھونکے ہمارے جسموں میں چھوئے باغ میں داخل ہوتے ہی ہم نے چنبیلی اور مولسری کے پھولوں اور ایسی مٹی کی خوشبو سونگھی جسے نہر کے پانی سے سیراب کیا گیا ہو۔ اور جہاں سے سارا دن تیز دھوپ میں گرم بخارات اُٹھتے رہے ہوں۔ شہر کی نسبت یہاں کی فضا آزاد اور مرطوب تھی۔ گرم ہوا بڑی نرمی سے چل رہی تھی اور گھنے درختوں کی گہری سبز شاخیں بے معلوم انداز میں ہل رہی تھیں ــــ سڑک پر چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ اور بجلی کے پرانے لیمپوں کی زرد روشنی میں وہاں سے نظر نہ آنے والی بھاپ سی خارج ہو رہی تھی۔ پسینوں پر پسینے آ رہے تھے اور عورتیں برقعوں سے پریشان ہو رہی تھیں۔ پر وہ کلب کے دروازے پر پہنچ کر انھوں نے اپنے برقعے اس پھرتی سے اتارے جیسے ان میں خطرناک بیماریوں کے جراثیم پیدا ہو گئے ہوں۔ اور لپک کر کلب میں داخل ہو گئیں۔ اندر چاروں طرف پردہ ہی پردہ تھا۔ اور کلب کا کہیں نشان تک نہیں تھا۔ گھاس کے معمولی سے خطے کے عین وسط میں آم کا ایک درخت تھا۔ جس کے پاؤں میں ایک دو شکستہ بنچ پڑے تھے۔ اور دوسری طرف دو پینگیں لٹک رہی تھیں۔ عورتوں کو یہاں صرف دو چیزیں کھینچ لاتی تھیں۔ پہلی چیز کلب کی پینگیں اور دوسری برقعہ سے نجات۔

میں کلب کے باہر بوڑھے پہرے دار کے مصلّے پر بیٹھ گیا اور اس سے وضو کے فوائد اور نماز کی برکتوں پر لیکچر سنتا رہا۔ وہ تسبیح پھیرتے ہوئے باتیں کر رہا تھا اور میں بڑی توجہ سے اسے تک رہا تھا۔ دراصل میں اسے نہیں بلکہ دوڑتے ہوئے سپید سپید پاؤں اور پھڑ پھڑاتی شلواروں کو تک رہا تھا۔ جو بوڑھے کی گردن کے

ے مجھے جھاڑیوں کے عقب میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔

کافی دیر بعد بھابھی، عظمی، ساجدہ، اماں اور چھوٹی بہنیں اور بچے باہر نکلے۔ سب کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اور ان کے جسموں سے گرم گرم پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ پردہ کلب سے ذرا آگے جا کر سپید گنبد والا ریڈیو اچانک شروع ہو گیا۔ نور جہاں کی تیز آواز ساری کمپنی باغ میں پھیل گئی۔

سے...... آرات جا رہی ہے.......

ہم لوگ گنبد کے دائیں طرف والے نئے پلاٹ میں داخل ہو گئے۔ جہاں سُرخ ...ں والی چکیلی روشوں پر سُرخ اور زرد گلاب کے پھولوں کی بیلیں سایہ کئے ...تھیں۔ اور نیچے پلاٹ میں پانی دیا ہوا تھا۔ میں، عظمی اور اماں ایک سنگین ...ست پر بیٹھ گئے، اور نور جہاں کا گانا سننے لگے۔ یہ جگہ ایک لمبے اور گنجان درخت کی اوٹ ...تھی۔ اور قریب جھاڑیوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ اماں بڑے غور سے گا... رہی تھیں۔

یہ بے بی نور جہاں ہے، اماں نے عظمی سے کہا۔ جس نے شاید ہی کوئی ہر ...ر کا ...نہ شو چھوڑا تھا۔ دوسرے لوگ پلاٹ کی روشوں پر آزادی اور مسرت کے ساتھ دوڑ ...تھے۔ ان کی ایک دوسرے کی پکارنے کی آوازیں باغ کی گرم اور کھلی فضا میں ...نج رہی تھیں۔

راجدہ دیکھ کر چلنا کہیں کانٹا نہ چبھ جائے۔ یہ آواز بھابھی کی تھی۔ میں نے پہلو بچا کر دیکھا۔ راجدہ دونوں ہاتھوں سے ساٹن کی سفید شلوار کے ...پائنچے اٹھائے پلاٹ کے پانی میں چل رہی تھی۔

"ادئی پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔ تم بھی آجاؤ، میں بھی آجاؤں؟ مگر کیسے؟" راجدہ نے بھابھی کو بلایا تھا۔ جو تھوڑی دیر بعد پانی میں اتر گئی۔ اور بچوں نے

بھی بڑوں کا ساتھ دیا۔ پانی گدلا تھا۔ اور اس کی سطح پر زرد زرد گھاس اور سوکھ
ٹہنیوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اور جو بچوں کے گھٹنے تک آتا تھا۔ بچے ہاتھوں سے
پانی کے چھینٹے اڑاتے، شور مچاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے ——
ان میں میری چھوٹی بہنیں بھی تھیں۔ اور چھوٹے بھائی بھی —— بھابی راجدہ
چھونے کی کوشش کر رہی تھی اور راجدہ ایک تتلی کی مانند پھرتی سے بھاگتی ہوئی
کبھی ایک پودے کا چکر لگاتی اور کبھی لپک کر دوسری طرف نکل جاتی۔ بیرا دل بھی
پانی میں اترنے کو چاہا۔ مگر ای کو دیکھتے ہوئے ہمت نہ پڑی۔ آخر میں عظمی سے کہا

" بھابی بھلا تم کیوں بیٹھی ہو۔ چلو پانی میں۔"

" نا بابا میرے پائنچوں کی کلف اتر جائے گی۔ اور میں ایک ہی شلوار ساتھ لائی ہوں"
جب یہ لوگ تھک گئے تو شلواریں قمیض جھاڑتے پانی سے باہر نکل آئے۔ بچوں نے
تو سارے کپڑے پانی میں بھگو ڈالے تھے۔ راجدہ کے بال کھل گئے تھے۔ جنھیں وہ لاپرواہی
سے پیچھے ڈالے ہوئی تھی۔ اور اس کی پیشانی اور مونچھوں والی جگہ پر پسینے کے
ننھے ننھے قطرے سڑک والے لیمپ کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ اتفاق سے میں
راجدہ کے قریب کھڑا تھا۔ اور راجدہ نے کئی بار مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے
اسے گلہ ہو کہ میں عظمی کے پاس کیوں بیٹھا رہا۔ اور پانی میں کیوں نہیں اترا۔ جب
وہ سینڈل کے تسمے باندھنے کے لئے جھکی تو ساکت فضا میں نرم ہوا کی لہریں سی پیدا
ہو گئیں۔ اور میں نے راجدہ کے پسینے میں ملی ہوئی حنا کی گرم اور خوشگوار
خوشبو سونگھی۔

جب ہم باغ سے نکلے تو ہوا بڑے پیارے انداز میں چلنے لگی۔
سڑک کے کنارے والے درختوں کی خاموش گپھاؤں میں بے معلوم سرگوشیاں

ہونے لگیں۔ گرمیوں کی رات کے گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کے چمکیلے پھول جا بجا کھلے ہوئے تھے۔ اور کمپنی باغ جہاں سے ریڈیو کی آواز ابھی تک آ رہی تھی بہاں پیچھے رہ گیا تھا۔ عظمی اور اماں آگے آگے تھیں۔ راجدہ اور بھابی ان کے پیچھے۔ میں ذرا پرے ہٹ کر بچوں کو لئے چل رہا تھا۔ راجدہ، قدرے اونچی آواز میں بھابی سے ہمکلام تھی۔

"سچ بس تو ایسی راتیں باغوں ہی میں گزارنا چاہتی ہوں۔ بس پائنچے اٹھائے پانی میں گھومتی پھرتی رہوں۔ اور جب تھک جاؤں تو گلاب کی پھوار بھری بیلوں کے سایہ میں ٹھنڈے بنچ پر سو جاؤں ______

خدا کی قسم گرمیوں میں گھروں اور گلیوں میں میرا دل بہت گھبراتا ہے۔"

وہ بڑی بے باکی سے اپنی خواہشات کا اظہار کر رہی تھی اور میں اس سوچ میں تھا کہ یہ وہی راجدہ ہے جو عظمی کے ساتھ چق کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اور جس نے مجھے دیکھ کر پردہ کر لیا تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت پھر سیر کی تیاری ہونے لگی۔ اس روز میرا پروگرام راجدہ کو کرسٹل میں آئس کریم کھلانے کا تھا۔ چنانچہ صبح ہی کو میں نے اپنی ایک ڈکشنری بیچ ڈالی تھی، جس کے عوض مجھے چھ روپے بارہ آنے ملے تھے۔ یہ رقم چھ سات لوگوں کو آئس کریم کھلانے کے لئے کافی تھی۔ سیر کے بعد میں ان سب کو کرسٹل لے آیا۔ کرسٹل کے ایک کیبن میں سوائے میرے اور ایک چھوٹے بھائی کے باقی سب لوگ بیٹھ گئے۔ ہم کرسٹل کے ہال کمرے میں بیٹھ گئے۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے مجھے راجدہ کی شکل اچھی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ وہی باریک ہونٹ خوب صورت، ستواں ناک، لمبی پلکوں کے پرسکون سایوں والی آنکھیں جو بڑی نرمی اور محبت سے ایک منظر سے دوسرے منظر کی طرف گھومنے کی عادی تھیں۔

ماتھے کے اوپر سر کے سیاہ بالوں کی ابھری ہوئی دو پہاڑیاں اور ان کے درمیان میں بہتی ہوئی مانگ کی دودھیا نہر ـــــ کرسٹل کے لیڈیز کیبن کے شیشوں میں سے راجدہ نے پہلی مرتبہ مجھے ہمدردی اور محبت کی پاک اور بے لوث نظروں سے دیکھا۔ اور میرے دل میں اس کی عزت اور توقیر اور بڑھ گئی۔ جیسے اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔

راجدہ کی نظریں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی اولیں نرم اور پاکیزہ کرنیں تھیں۔ جو نیند میں شرابور پھولوں کے لئے پیغام بیداری لے کر آتی ہیں۔ کرسٹل سے نکل کر ہم لوگ گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ایک جگہ بازار میں اندھیرا سا تھا۔ اور لوگ نسبتاً کم آ جا رہے تھے۔ راجدہ نے نقاب اٹھا کر پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ سیاہ نقاب میں اس کا صندلی خوب صورت چہرہ ـــــ جیسے رات کی تاریکی میں کسی خانقاہ کا کھلا اور روشن طاق۔ جہاں موم بتیاں جل رہی ہوں۔ (دراصل راجدہ کو پہلی بار دیکھنے پر جو خیال سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا تھا وہ محض ایک مرمریں بتی کا خیال تھا ـــــ موم بتی۔ خاموش اور بے زبان) میرے ساتھ چونکہ بچے بھی تھے۔ چنانچہ لازمی طور پر سب سے پیچھے تھا۔ راجدہ بھی ہولے ہولے پیچھے آتی گئی۔ قریب پہنچ کر اس نے بچوں کو تیز چلنے کو کہا۔ اور مجھے دیکھ کر بولی ـــ "آپ بھی بچے ہیں کیا؟" اور اتنا کہہ کر جلدی سے آگے نکل گئی میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس رات خواب میں راجدہ کو میں تمام رات کمپنی باغ کی سیر کرواتا رہا اور کرسٹل میں آئس کریم کھلاتا رہا۔ دوسرے دن ـــــ دوپہر کے کھانے کے بعد کیرم بورڈ کھیلتے ہوئے سینما کا پروگرام بن گیا۔ فلم تھی "من کی جیت" جو مجھے بیحد پسند تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ راجدہ بھی اُسے دیکھے۔ دعوت بھی میں نے دے ڈالی اور پھر اس سوچ میں پڑ گیا کہ ٹکٹوں کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ الف لیلیٰ

حاتم طائی کی با تصویر اور محبت بھرے خطوط، بہشتی زیور اور جنت کی کنجی بیچنے گیا۔
سی دوکان دار نے یہ کتابیں نہ خریدیں ــــــ اسی سے کچھ روپیہ ادھار مانگے۔
اس نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ تنخواہ ملنے کے بعد
دو تین دن تک امرتسر نہیں آیا کرتا ــــــ نہ معلوم راجدہ میری اس ذہنی
شانی کو کس طرح بھانپ گئی۔ چنانچہ اس نے اعلان کر دیا کہ فلم ہم سبھی دیکھیں گے
س شرط پر کہ ٹکٹیں اپنی اپنی لینی پڑیں گی۔ اس پر میں نے بڑی مخالفت کی۔
تے ہوئے کہ کہیں میری مخالفت کامیاب ہو گئی تو پھر کیا ہوگا مگر خیریت گزری کہ
ہ کی اسکیم باتفاق رائے پاس ہو گئی اور سینما کی تیاریاں ہونے لگیں نہایا گیا۔
ے بدلے گئے۔ جوتے پالش ہوئے۔ امی نے پان کے ٹکڑوں سے ڈبیا بھر لی۔ بھاجی
ینا کی ساری شیشی اپنے کپڑوں پر انڈیل لی۔ اور اس کی تیز خوشبو سے دماغ چکرانے
ایک طرف راجدہ بال بنا رہی تھی۔ عظمی نے استری گرم کر رکھی تھی۔ اور تین چار
ال آگے ڈالے انھیں نم کر رہی تھی۔ میں نے کہا" بھابی تم نے اچھا کیا جو تین چار
ال رکھ لئے۔ فلم میں کئی بار آنسو نکل آتے ہیں۔ عظمی بھابی مسکرانے لگی۔ اور راجدہ
ھابی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
" ہمیں رونا نہیں آتا" اور میں بے اختیار کہہ اٹھا" خدا نہ کرے کہ رونا آئے"۔
ظمی نے زیر لب ہنس کر پوچھا" راجدہ کا بڑا خیال ہے" راجدہ شرم سے ڈوب سی
میں خود بات کر کے پشیمان ہو رہا تھا۔ بھابی نے پلٹ کر عظمی کی طرف دیکھا جو
ال استری کر رہی تھی۔ اور جس کے ہونٹوں پر اس کے ناک سے زیادہ پتلی مسکراہٹ
ہو لی تھی اور ہنس کر بدستور سوٹ کیس میں سے کچھ نکالنے لگی۔
ــــــ سینما ہال میں انٹرول کے وقت میں نے عظمی سے فلم کے بارے میں
کی رائے پوچھی جس پر وہ شرما سی گئی۔ شاید اسے ستارہ ٹوٹنے والے استعارے

کا خیال آگیا تھا۔ جس کے فوراً ہی بعد انٹرول ہو جاتا ہے۔ راجدہ اور بھابی، امی کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں اور اس سے پان لے کر کھا رہی تھیں۔ میں اٹھا اور پان خریدنے کے لئے باہر بازار میں آگیا۔ پان میں نے علیحدہ علیحدہ بندھوائے۔ اس طرح مجھے یقین تھا کہ راجدہ کو بھی میں خود پان پیش کر سکوں گا۔ پان لئے جب میں بکس میں داخل ہوا تو فلم شروع ہو چکی تھی۔ اندھیرے اور فلم کی ہلکی روشنی میں مجھے ان لوگوں کے صرف سر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے سب کو پان پیش کر دیئے۔ اور جب راجدہ کی باری آئی تو میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ——— اُف توبہ! ——— اس کا ہاتھ کس قدر سرد ہو رہا تھا جیسے میں نے برف سے لدے ہوئے گلاب کے پھولوں پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کے ہاتھ میں اس کے حصے کا پان ویسا ہی پڑا تھا۔ اور میں اس کے دل کی تیز دھڑکن اچھی طرح محسوس کر رہا تھا میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور باقی وقت ہال میں بیٹھا راجدہ کے ہاتھ کی نرمی اور سردی کو اپنے جسم میں پھیلتے محسوس کرتا رہا۔ فلم ختم ہو گئی اور ہم گھر آگئے۔

رات بھر راجدہ کے ہاتھ کا سرد لمس مجھ پر دھندلے بادل کے ٹکڑے کی مانند سایہ فگن رہا۔ اور میں نے اسی خیال میں رات گزار دی۔

صبح اتوار تھی ——— دوپہر کے وقت بھابی نے ڈھولک بجانے کا پروگرام پیش کر دیا۔ جسے بچوں اور چھوٹی بہنوں نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا ——— تھوڑے سے وقفہ کے بعد کہیں سے کسی ہوئی تیز اور گمک دار ڈھولک بھی آگئی اور بچے اُلٹے سیدھے ہاتھ مارنے اندھے سُری الاپنے لگے۔ بالآخر بھابی آگے بڑھی اور ڈھولک ایک جچی تلی تال پر دھمکنے لگی۔ دو تین منٹ تک لگاتار خالی ڈھولک ہی دھمکتی رہی۔ اور کسی کے گانے کی آواز نہ آئی۔ بھابی تھم گئی اور چہک کر بولی۔ "بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی گاتی کیوں نہیں؟"

راجدہ نے شرما کر منھ پھیر لیا۔ اور بھابی عظمی ہنسنے لگی ـــــ اور بھابی کو غصہ آگیا۔ اس کا گول گول منھ لال ہو گیا اور بھویں سکڑ گئیں۔ اس نے ایک ہاتھ زور سے ڈھولک پر مارا۔ اور گانا شروع کر دیا۔

ــــ اساں نوں وی تڑکی اے۔

ادھی راتیں ویر آیا ـــــ گر گابی کھڑکی اے۔

اس نے ڈھولک کی تھاپ کے درمیان ہی تیز آواز میں کہا۔ "بھئی یہ تو بڑی بری بات ہے گاؤ نا سب، آخر یہ منگوائی کس لئے ہے؟"

چنانچہ بھابی عظمی نے منھ پکا بنا کر گلا صاف کیا اور بول اٹھائے اس کی آواز نرم اور لوچدار تھی۔

ــــ پیا جھرمٹ بدلاں دا۔

روواں رات دنے ـــــ اے وچھوڑ سجناں دا

اب راجدہ کی باری آئی۔ اس نے گردن نیچی کر لی۔ عظمی اور بھابی اور بچے ہنسنے لگے۔ اتنے میں ایک نرم اور نکھری ہوئی آواز ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ اوپر اٹھی۔ بلبلے کی طرح بے چین ـــــ مضطرب اور زخم خوردہ ـــــ

ــــ دو پترا ناراں دے۔

ساڈا دکھ سن سن کے ـــ روندے پتھر پہاڑاں دے۔

اور میرے ذہن میں ایک تصویر کھنچ گئی۔ جیسے کوہ بندھیاچل کے ... رات میں موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور تیز رفتار پہاڑی نالے نشیب کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ تصویر کچھ غلط تھی۔ پھر ایک اور تصویر سامنے آئی۔ سادہ سوگوار سی۔ جیسے شام کا گیت۔

سنسان پہاڑیوں پر رم جھم رم جھم۔ مدھم بارش میں غمگین موسیقی اور ادھر ادھر

پتھروں کو سیاہ اور چکنی سلوں پر سے رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر پھسلتے ہوئے بارش کے موتی
ـــــ پتھروں کے آنسو ـــــ

؎ روندے پتھر پہاڑاں رے ....

ڈھولک تھم گئی۔ شعلہ بجھ گیا مگر سنسان اور گمنام پہاڑوں کے آنسو رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر بدستور گر رہے تھے .... اور میں اُن سے پوچھنا چاہتا تھا تم کس کی یا میں آنسو بہا رہے ہو؟

میں راجدہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ راجدہ تمہیں وہ کون دُکھ ہے جسے سُن کر پہا بھی رونے لگے؟

میں راجدہ سے پوچھنے کے لئے آگے بڑھا اور راجدہ امرتسر کے اسٹیشن پر پلیٹ فا نمبر ۴ پر بھابی اور عظمیٰ کے ہمراہ لاہور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سوگوار سی تھیں۔ گھنی پلکوں کی پرسکون چھاؤں میں کہیں کہیں مدھم اور اُداس دھوپ کی چمک تھی۔ گاڑی چل پڑی۔ پلیٹ فارم پیچھے اور گاڑی آگے کھسکنے لگی۔ راجا نے آخری بار مجھے دیکھا۔ اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ ہمارے گھر ضرور آنا۔

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اور میں اسٹیشن پر اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ مجھے واپس گھر جاتے ہوئے ایک قسم کی جھجک سی محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ میرا گھر نہ ہو۔

اسٹیشن سے نکل کر میں سیدھا کرسٹل چلا آیا اور کافی دیر وہیں بیٹھا رہا۔ جب شام ہو گئی تو میں اُٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ گلی اور بازار میں کافی رونق تھی۔ پر مجھے ہر شے اجنبی اور بے محل سی لگ رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے کسی سے بات نہ کی اور کھانا کھا خاموشی سے لیٹ گیا۔ صبح اُٹھا اور نوکری پر لاہور چلا آیا۔

لاہور پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں کئی سال سمندر پار بسر کرنے

ے بعد پہلی مرتبہ اپنے وطن میں داخل ہو رہا ہوں۔ سڑکوں پر لوگوں کے چہرے مہربان اور مانوس معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے ان کے دل میری دوستی اور ہمدردی سے لبریز ہوں۔ دفتر سے نکل کر میں نے کئی بار راجدہ کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ مگر یہ خیال کہ اتنی جلدی وہاں چلے جانا مناسب نہیں، ہر بار مجھے روک دیتا۔

ایک روز بڑی آپا کو لاہور اچانک کوئی کام پڑ گیا۔ وہ میرے ساتھ لاہور آ گئیں اور میں انھیں راجدہ کے گھر لے گیا۔ میں راجدہ کے گھر پہلی مرتبہ داخل ہو رہا تھا و... گ ـــــ جو بعد ازاں میرے دل پر گہرا اثر چھوڑ گیا ـــــ عظمیٰ اور راجدہ ہمیں مکان کی ڈیوڑھی ہی میں مل گئیں۔ وہ دونوں ایک بڑھیا سے جانے کیا خرید رہی تھیں مجھے اور آپا کو اپنے بالمقابل دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئیں اور حیرت اور خوشی سے ان کے چھوٹے سے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ راجدہ کے بال کھلے تھے۔ شاید وہ نہانے کی تیاری میں تھی۔ وہ ہم دونوں کو جلدی سے اوپر لے گئیں اور ہم درمیانی منزل میں پہنچ کر بیٹھ گئے بھابی عظمیٰ نے پنکھا چھوڑ دیا۔

یہ کمرہ ہر قسم کے گھریلو سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف شیشوں کی قد آدم الماریوں میں چینی کے برتن سجے تھے۔ دوسری طرف لمبے چوڑے خوب صورت پلنگ پر ریشمی تکیے اور سوتی کی سفید چادر پڑی تھی۔ نعمت خانے کے قریب میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ آدھے فرش پر مٹیالے رنگ کا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ سنگھار میز کے گول آئینے پر جالی دار ریشمی پردہ لٹک رہا تھا۔ ایک طرف کوئی اور پاؤنڈز اور پیرس کی شام کی مختلف سائز شیشیاں پڑی تھیں۔ کارنس پر دونوں طرف پتلی اور لمبی گردن والے پھول دانوں میں گلاب کے پھول مسکرا رہے تھے۔ قریب ہی ایک چمکیلا سگریٹ کیس اور ماچس اور کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ کارنس کے اوپر خوب صورت فریم میں سجی ہوئی ایک رنگین تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ قدیم ایرانی تمدن کا ایک منظر تھا۔ شہر کا محراب دار

بڑا دروازہ ــــ اس میں سے نکلتے اور داخل ہوتے لمبے چغوں اور عمامے والے لوگ ــــ دروازے کے بائیں سمت جالی دار جھروکوں والے مکان کے پیچھے اوپر کو اٹھتے ہوئے مسجد کے دودھیا مینار اور ان کے عقب میں نیلے آسمان پر سفید کبوتروں کی ٹولیاں ــــ مجھے یہ تصویر بے حد اچھی لگی۔ راجدہ اندر داخل ہوئی اس نے جلدی سے ایک تپائی ہمارے آگے رکھی اور باہر نکل گئی۔

پھر عظمیٰ آئی اور اس کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت ہاتھوں میں اخروٹ کی لکڑی کا ایک ٹرے تھا۔ جس میں جھاگ دار دسٹو سے لبالب بھرے ہوئے دو گلاس رکھے گئے تھے۔ آپا نے کہا۔ آخر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ مگر میں خاموشی سے دسٹو پینے لگا۔ کیونکہ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد راجدہ کی ادھیڑ عمر پتلی دبلی بے زبان سی ماں اور دوسری بھابی اختر بھی آگئیں وہ ہم سے خندہ پیشانی سے ملیں اور آپا کے پاس بیٹھی باتیں کرنے لگیں۔ ان کی باتیں لاہور کی گرمی، پیراشوٹ کی کلیوں، ریل کی دقتوں اور قمیصوں کے نت نئے نمونوں کے متعلق تھیں جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی ان کی آواز مجھے بہت خوش گوار محسوس ہو رہی تھیں۔ راجدہ بھی ایک طرف بیٹھی گفتگو میں شامل تھی۔ اس وقت گھر کی ہر چیز دیا سلائی کی ڈبی سے لے کر راجدہ کے کھلے بالوں تک، مجھے اپنی محسوس ہو رہی تھی جیسے یہ گھر میرا ہو۔ اس گھر میں میں نے پہلی مرتبہ کھلے آسمان اور چمکیلا دھوپ کو دیکھا ہو۔ اور اسی ایرانی قالین پر میں نے لڑھک لڑھک کر چلنا سیکھا ہو اور اسی گھر کے باہر نیم روشن ٹھنڈی گلیوں میں، چالاک بچوں کی منڈلیوں میں میں نے اپنا بچپنا گزارا ہو۔ یہ اجنبی اور مہربان خیال مجھے راجدہ کے اور قریب لے گیا۔

پھر راجدہ کے دونوں بھائی آگئے۔ ہنس مکھ اور دوست نواز ــــ میں ان سے اٹھ کر ملا اور ہم دیوان خانے میں چلے آئے۔ یہ لمبا اور کھلا کمرہ اوپر کی نسبت زیادہ

سرد اور پُر سکون تھا۔ یہاں سوائے ایک بڑی الماری، زمین پر بچھی ہوئی دری اور میز کے علاوہ تین چار آرام کرسیوں اور آتش دان کی کارنس پر رکھی ہوئی قائد اعظم کی رنگین تصویر کے اور کچھ نہ تھا۔ مجھے اس کمرے کی سادگی اور خنکی بے حد تسکین بخش محسوس ہوئی۔ ہم کچھ دیر تک وہاں بیٹھے۔ نئی فلموں کے گانوں، تاش کے کھیلوں اور لیگ پارٹی کی خدمات پر باتیں کرتے اور سگریٹ پیتے رہے۔ اس دوران میں مجھے اوپر سے راجدہ کی تیز اور بے ساختہ قہقہوں کی صحت مند آواز کئی بار سنائی دی۔ ساڑھے بارہ بجے دوپہر کی مجلس کا گجر بجا۔ تو ہم اوپر چلے گئے۔ راجدہ خود ریڈیو لگا رہی تھی۔ پہلا ریکارڈ شروع ہوا۔

"من کاہے گھبرائے ....

اور راجدہ نے کنکھیوں سے پل بھر کے لئے مجھے دیکھا اور مجھے سینما ہال والی وہ رات یاد آ گئی۔ جب پان پیش کرتے وقت میں نے اس کا نرم اور سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ گانے کی دھیمی اور دلنواز سریں کمرے کی پُر سکون اور خوشبوؤں بھری فضا میں تیر رہی تھیں۔ اور راجدہ سب کی نظریں بچا کر میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں چاندنی کی نرم خنکی اور بہار کی اولین صبح کا اُجلاپن تھا۔ اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اکھڑ اُجڈ لوگوں سے بھری ہوئی کسی پُر شور ریل گاڑی سے نکل کر نرم دل گارڈ کے ڈبے میں آن بیٹھا ہوں۔ اور میں شام تک گارڈ کے ڈبے میں بیٹھا رہا۔ اور اگر آپا چلنے کو تیار نہ ہوتیں تو شاید میں تمام عمر اس ڈبے میں بیٹھا سفر کرتا رہتا۔ اسٹیشن پر اسٹیشن گزرتے جاتے۔ منزلوں پر منزلیں آتیں۔ اور میرا اسٹیشن کبھی نہ آتا۔ میری منزل کبھی نہ آتی ......

آپا برقعہ پہننے لگیں۔ مجھے بھی کوٹ پہننا پڑا۔ جب ہم چلنے لگے تو راجدہ نے پوچھا۔ پھر کب آئیں گے آپ؟" اور آپا نے کہا۔

اب آپ لوگوں کو آنا چاہیئے۔ لیکن ان لوگوں میں سے کوئی نہ آیا۔ اور تیسرے دن میں خود راجدہ کے گھر چلا گیا —— وہ شام نہایت خوش گوار تھی۔ بارش ابھی ابھی رُکی تھی۔ اور آسمان ابھی تک ابر آلود تھا۔ مکانات اور سڑکیں دھلی ہوا تھیں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بازاروں اور گلیوں میں لہرا رہے تھے۔ ٹھیک یاد نہیں غالباً ستمبر کا آخر تھا۔

راجدہ کا بھائی گلی کے موڑ پر ہی مل گیا۔ گھر پہنچ کر ہم دیوان خانے میں بیٹھ گئے اختر اور علمی بھی وہاں آگئیں۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد راجدہ بھی نیچے آکر ہمارے قریب بڑی الماری میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ پھر چائے آگئی۔ چائے کی سبز پھولدار پیالیاں ہاتھوں میں تھامے ہم لوگ گرم جوشی سے باتیں کر رہے تھے کہ باہر ڈیوڑھی میں سائیکل کھڑی کرنے کی آواز آئی۔ سب ایک دم چپ ہو گئے۔ راجدہ کا بھائی زیر لب مسکراتے ہوئے بولا ”چچا آ رہے ہیں“۔

پھر دروازہ کھلا اور ایک چچا نمودار ہوا۔ جس نے نیکر پہنی تھی اور جس کے گندمی چہرے کی کھال کرخت اور کھچی ہوئی سی تھی۔ ایک ہاتھ سے مہندی لگا سر جھاڑتا ہوا ہمارے قریب آکر رُک گیا۔ میرا تعارف کروایا گیا۔ مگر اس نے میری طرف سرسری انداز میں دیکھا۔ اور بڑی بے نیازی کے ساتھ میری کرسی کے عقب سے ہو کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے پاسنگ شو کا سگریٹ نکال کر اس نے سلگایا۔ اور منہ سے دھوئیں کا غبار سا چھوڑتے ہوئے بولا ”آج کیندِ آدم کی تقریر ہو رہی ہے“۔

پہلے تو میں قائدِ اعظم پر بالکل حیران نہ ہوا۔ کیونکہ اس روز واقعی منٹو پارک میں کیندِ آدم کی تقریر ہو رہی تھی۔ لیکن جب بعد میں چچا صاحب کی کارگیری کا احساس ہوا تو میں بمشکل اپنی ہنسی روک سکا۔

"ہاں ہو رہی ہے۔ تم بھی چلو گے چچا؟" راجدہ کے بھائی نے کہا۔
پہلے تو چچا آنکھیں ملتا اور جھپکاتا رہا۔ پھر پاسنگ شو کا لمبا کش لگا کر بولا۔
"بھئی چلیں گے ضرور مگر شطرنج بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔"
"حد ہو گئی ــــ چچا وہاں شطرنج کا کیا کام؟" اور چچا پاسنگ شو کی راکھ جھاڑ کر بولا۔ "میاں جب تقریر سنتے سنتے تھک جائیں گے تو پھر کیا کریں گے۔ اتنے بھرے مجمع میں سے اٹھ کر چل پڑنا بھی تو مناسب نہ ہوگا۔ اور اگر شطرنج بھی پاس ہی ہوگی تو کیا کہتے ہیں پھر ــــ قائد آدم، خواہ ساری رات تقریر کرتا رہے"۔ اس کے بعد وہ اُٹھا اور سر جھاڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

راجدہ کے بھائی نے مجھے بتایا کہ چچا کو شطرنج سے حقیقی عشق ہے اور وہ اکثر یاروں کی ٹولی میں گلی کے کونے پر بیٹھا۔ کمیٹی کے لیمپ کی روشنی میں رات رات بھر شطرنج کھیلتا رہتا ہے۔ اور کچھ دیر تک میں راجدہ کے گھر میں بیٹھا، راجدہ کے خیال سے بے تعلق اس کے چچا کی دل چسپ شخصیت کے متعلق سوچتا رہا۔ اور جب میں راجدہ کے گھر سے نکل کر گلی میں سے نکل رہا تھا تو مجھے اس کا چچا ایک خالی دوکان میں دکھائی دیا۔ اس کے آگے شطرنج کی بساط پر مہرے بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑے اور دوسرا ہاتھ صدری کے جیب میں ٹھائے مہروں پر جھکا ہوا تھا۔ جیسے وہ خیال ہی خیال میں کسی غیبی آدمی سے بازی لگائے ہوئے ہو۔

دو تین ہفتے گزر گئے اور میں راجدہ کے ہاں نہ جا سکا۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے دیوان خانے میں بیٹھا چند نئی تصاویر کو البم میں لگا رہا تھا کہ ڈاکئے نے راجدہ کا خط چق اُٹھا کر اندر پھینکا۔ یہ خط بڑی آپا کو لکھا گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک علیحدہ رقعہ میرے نام بھی تھا۔ راجدہ کی طرف سے میرے نام اس کا یہ پہلا خط تھا۔ جسے میں نے کئی بار پڑھا۔ اور جس کے مختصر اور پر محبت الفاظ بہت جلد مجھے ازبر ہو گئے۔

راجدہ نے جواب کے لئے اپنی کسی سہیلی کا پتہ لکھا تھا میں نے اسی وقت کاغذات اور قلم لئے اور ایک لمبا چوڑا خط راجدہ کو لکھ ڈالا۔ تیسرے ہی روز میرے خط کا جواب بھی آگیا میں نے اسی وقت ایک اور خط لکھ ڈالا جس کا جواب بھی مجھے تیسرے روز مل گیا۔ میرے لئے یہ کام راجدہ کو ملنے سے بھی زیادہ دل چسپ اور رومانی تھا۔ چنانچہ میں نے قصداً راجدہ کے ہاں جانا بند کر دیا۔ اب اس کے خطوط میں خطرناک حد تک پہنچی ہوئی بے قراری اور بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک خط میں لکھا آیا "میں بیمار ہوں"

اب میرے لئے مزید رکنا محال تھا۔ دوسرے ہی روز میں راجدہ کے ہاں نچلے کمرے میں بیٹھا اختر اور عظمی سے باتیں کر رہا تھا۔ دراصل راجدہ بیمار نہیں تھی۔ یہ محض مجھے بلانے کے لئے ایک چال چلی گئی تھی جس میں اختر بھی شامل تھی۔ بطور احتجاج میں راجدہ سے بالکل نہ بولا۔ پہلے پہل وہ میری اس ناراضی کو عارضی سمجھتے ہوئے مجھے بات بات پر چھیڑتی اور مذاق کرتی رہی۔ لیکن جب میری خاموشی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی گئی تو وہ پریشان سی نظر آنے لگی۔ باہر گلی میں عورتوں کے درمیان کچھ جھگڑا سا ہو گیا۔ اور عظمی اور اختر جلدی سے کھڑکیوں کی طرف بھاگ اٹھیں۔ کیونکہ ایک عورت نے دوسری کو بڑی بھدی دار گالی دے ڈالی تھی۔ راجدہ موقع پا کر میرے قریب آگئی۔

"کیا ہو گیا ہے؟"

میں خاموش رہا۔

"کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی مانگتی ہوں۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا" ـــــــ میں نے گرے گرانٹ کے انداز میں کہا۔ وہ فلم نٹوریس میں انگرڈ برگمین کو اسی انداز میں کہتا ہے۔ یہ فلم میں نے اسی روز ریگل میں دیکھی تھی۔ راجدہ اگر انگرڈ برگمین ہوتی تو اپنے خاص انداز میں لمبی اور گداز باہیں میرے گلے میں ڈال دیتی اور گرے گرانٹ کی ساری خفگی رفو چکر ہو جاتی۔ مگر اس بیچاری کو برگمین

ے منانے کے انداز کی کرا خبر تھی۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اُٹھا زیادہ پریشان ہو گئی۔
ی والا جھگڑا ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اور عظمی اور اختر اندر آرہی تھیں۔
"بڑی بدمعاش ہے یہ" اختر نے عظمی سے کہا۔ اور اس نے ہاں میں ہاں ملا دی۔
ہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئیں۔ راجدہ اٹھی اور اوپر چلی گئی۔ میں تقریباً
ڑھ گھنٹے وہاں اور بیٹھا رہا۔ لیکن راجدہ بالکل نیچے نہ اتری۔ عظمی آرام کرسی پر
م دراز تقریباً سو رہی تھی۔ اختر کروشیا کا ڑھ رہی تھی۔ میں نے کہا راجدہ ناراض کیوں
ہے؟ اس نے کہا خود ہی پوچھ لو۔ اوپر ہوگی، اور مسکرانے لگی۔ میں ایک لفظ کہے بغیر اوپر
چلا گیا۔
راجدہ درمیانی منزل میں پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔
ں نے قریب جا کر اسے پکارا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"راجدہ، میں یہاں نہ آیا کروں؟" میں نے محسوس کا کیا راجدہ کا جسم ہولے ہولے
ا رہا تھا۔
"اگر تم چاہتی ہو تو خدا کی قسم میں اپنا آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے چھپا لوں گا۔"
اجدہ خاموش رہی۔ میں نے کندھے سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کر لیا۔ راجدہ
رہی تھی۔ کبھی پلکوں کی خنک چھاؤں میں بارش کی جھڑی لگ رہی تھی۔ رم جھم رم جھم —
—— اور سیاہ پتھروں کی چکنی سلوں پر سے پانی کے شفاف قطرے رک رک کر پھسل
ہے تھے۔ سے روندے پتھر پہاڑاں دے۔
چند لمحات کے لیے ہم خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتے رہے — بے زبان
ور مسحور —— جیسے ہمیں جادو کی چھڑی چھو گئی ہو۔ راجدہ کے آنسو نہیں تھمتے
تے۔ میں نے آہستہ آہستہ راجدہ کی گرم پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا راجدہ، زندگی کے ہر دور میں تمہارے ساتھ

رہوں گا ملا کرتا ہوں۔ اور جلدی سے اُٹھ کر نیچے چلا آیا۔ نچلے کمرے میں عظمی بدستور چھوٹا سا منہ کھولے سو رہی تھی اور اختر کروشیا سے کاڑھ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

"پوچھ آئے کیا؟"

"پچپنا بہت ہے بھابی!" میں نے سگریٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"چلئے" اختر نے آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

"اور کیا ـــــ گلی میں سے گزرتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو راجدہ کھڑکی میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں بدستور سوجھی ہوئی تھیں۔

راجدہ کے گھر میں داخل ہو کر ایرانی قالین پر نیم دراز ـــــ محبت اور تسکین سے پُر لمحات کے درمیان کارنس کے اوپر ٹنگی ہوئی مشرقی تمدن کی تصویر کو گھورتے ہوئے میں نے کئی بار شیراز کے بجھتے ہوئے نیم روشن بازاروں اور ہرے بھرے شاداب باغوں اور پُراسرار قہوہ خانوں کی سیر کی ـــــ قہوہ خانے جہاں ایران، مصر اور شام کی زہرہ جمال دوشیزائیں سوڈانی دف بجاتے ہوئے محو رقص تھیں اور ہرے بھرے باغات کا پُرسکون سلسلہ جہاں نازک اور خوب صورت روشوں کے اِدھر اُدھر جا بجا دلکش فوارے چاندی ایسا پانی اگل رہے تھے۔ اور جہاں شیریں میووں سے لدے پھندے درخت تھے۔ اور جن کے عقب میں نیلے افق پر شیراز کی مسجدوں اور خانقاہوں کے دودھیا گنبد ـــــ

تنہائی اور خاموشی کے یہی وہ لمحات ہوا کرتے جب مجھے ہر اندھیرے کی تہہ سے روشنی کے ننھے منے انار سے چھوٹتے دکھائی دیتے اور مجھے کئی بار یوں دکھائی پڑتا کہ کوئی غیر مرئی شئے روشنی کا دیا لئے تاریکی کے خوفناک سمندر کو چیرتی سر بفلک لہروں میں کبھی ڈوبتی کبھی ابھرتی آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم میری طرف بڑھ رہی ہو۔

تنہائی روشنی ہے ـــــ اور راجدہ کے تصور میں ڈوب کر میں اس روشنی سے بار چند صیا کر رہ گیا۔ راجدہ کا خیال مجھے سب سے الگ ہو جانے پر مجبور کر دیتا اور سب سے الگ ہو کر میں کئی بار راجدہ کے خیال سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ ۔۔۔جدہ کا تصور مثل ایک پل کے تھا۔ جو خاموشی اور تنہائی کی اتھاہ خلیج پر پھیلا تھا۔ اور جسے عبور کرنے پر میں اپنے تئیں ایک انوکھی، روشن اور ان دیکھی دنیا ۔۔۔پاتا تھا جہاں سوائے چمکیلے افق، دودھیا گنبدوں اور ابھرا بھر کر ڈوبتی ۔۔۔ئی لمبی لمبی سوگوار تانوں کے اور کچھ بھی نہ تھا ـــــ سلسلہ در سلسلہ ۔۔۔ہرائی تاثرات میں ڈوبے ہوئے نورانی لمحات کے منور ٹکڑے تھے۔ جن کا راجدہ سے ۔۔۔ئی تعلق نہ تھا۔ اور جنھیں میں راجدہ سے الگ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

نومبر ختم ہو رہا تھا۔ رات کو اچھی خنکی ہو گئی تھی۔ اور دن کو لوگ دھوپ ۔۔۔اؤں کے سنگم پر چلتے تھے۔ ایک شام دفتر سے گھر لوٹتے ہوئے دل غیر معمولی طور پر اداس ۔۔۔نا۔ ایک تو راجدہ کو دیکھے ہفتہ ہو چلا تھا۔ اور دوسرے کچھ فضا کا بھی اثر تھا۔ اپنی ۔۔۔لی میں پہنچتے ہی مجھے یوں ہی خیال آیا، اگر گھر راجدہ بیٹھی ہوئی ہو تو؟ ـــــ تو پھر؟ ـــــ ۔۔۔یلن میں نے جھک ماری تھی۔ اور میں ہنسنے لگا۔ مگر گھر پہنچ کر جب راجدہ کو دیکھا تو میرا ۔۔۔ اچھل کر میرے منھ کے قریب آ گیا۔ کیا یہ جھک ماری گئی تھی۔ یا خدا نے میری دعا ۔۔۔بول کی تھی۔ راجدہ کی محبت نے مجھے گلی میں ایسا سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

راجدہ باورچی خانے میں امی اور آپا کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس کی پیشانی پر ۔۔۔ونے کا چھوٹا سا جھومر لیمپ اور جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل سا گیا۔ جیسے دھندلے رنگ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اچانک سورج کے سامنے آ گیا ہو۔ اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اور میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گھر میں راجدہ کے ساتھ آیا ہوا کوئی، محافظ دکھائی نہ دیتا تھا۔

"تم اکیلے کیسے آگئیں؟"

"اکیلی تو نہیں آئی" بیر بلی آپا نے کہا: خالہ کے لڑکے کے ساتھ اپنی خالہ سے ملنے آئی تھی، اور .... راجدہ نے آپا کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔

.... اور میں نے سوچا آپا اور امی سے بھی مل آؤں ــــ کس قدر شیریں تھا اس کا لہجہ ــــ جیسے میٹھے پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیوں پر بارش کے پہلے قطرے گر رہے ہوں۔

گلی میں اس جگہ اس رات کو قوالی تھی۔ جس جگہ یہ محفل منعقد ہونے والی تھی۔ اس کے عین اوپر آپا کی ایک سہیلی کا مکان تھا۔ بچے اور چھوٹی بہن تو سرِ شام ہی اس مکان میں پہنچ چکی تھیں۔ امی اور آپا وغیرہ میرے کھانے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانے کے بعد میں نے سیر کی تجویز پیش کر دی۔ آپا اور امی نے کہا "بھئی ہم تو نہیں جائیں گے۔ تم دونوں ہو آؤ" ــــ راجدہ بخوشی تیار ہو گئی۔ جب ہم دونوں نیچے اترنے لگے تو امی بولیں "د بھئی جلدی پلٹنا! راجدہ کو قوالی بھی سنانی ہے۔

راجدہ اور میں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے "فکر نہ کرو امی ہم ابھی آئے"

نیم روشن گلیوں اور بارونق بازاروں کو خاموشی سے عبور کر لینے پر جب ہم کمپنی باغ والی کھلی سڑک پر آ گئے۔ تو میں نے راجدہ سے پوچھا۔

"یہ خالہ زاد بھائی کون ہے؟"

"بڑا اچھا لڑکا ہے سچ ــــ اسے ہماری محبت کا علم ہے۔ اس کی بھی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ وہ دونوں ہماری طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ دونوں نے شادی تک بڑے بڑے دکھ اٹھائے ہیں اسی لئے تو وہ خود مجھے یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ شاید پرسوں مجھے پھر لینے آئے اور اس کی بیوی تو اس سے بھی زیادہ پیاری ہے......"

"راجدہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ہم اکیلے سیر کرنے جا رہے ہیں۔ کاش کمپنی باغ

کبھی دیکھنے۔" اور راجدہ ہنس پڑی۔

"کمپنی باغ نہیں آئے گا تو پھر ہم سیر کہاں کریں گے؟"

اور کمپنی باغ آگیا۔ جب ہم اس پلاٹ کے قریب سے گزرے جہاں سُرخ روشوں پر گلابی اور زرد رنگ کے گلاب کے پھولوں کی بیلیں اپنا پُرسکون سایہ کئے تھیں۔ تو راجدہ بولی۔

"وہ شام یاد ہے نا!"

"ہاں راجدہ وہ شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ ہماری محبت کی اوّلین شام تھی اور اس کا نقش بڑا گہرا اور دیرپا ہے۔ اسی شام ہماری محبت نے ان رنگ برنگے پھولوں اور بیلوں کے درمیان اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ اس مرطوب سبزہ زار میں ——— اور اسی جگہ میں نے پہلی مرتبہ تمہارے گرم پسینہ کی خوشگوار خوشبو سونگھی تھی جس میں حنا کی خوشبو بھی شامل تھی۔

آج راجدہ نے مُنہ سکوڑ کر کہا۔" کیسی باتیں کرتے ہو؟"

"تم نہیں جانتی راجدہ، یہ میری اپنی باتیں ہیں۔ تم محض سنتی جاؤ۔ تمہیں کیا خبر میری محبت بہ یک وقت کہاں کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور کہاں جاکر ختم ہوتی ہے۔ یہ بہار کے پھولوں کی مانند مجھے اپنے جسم کے ذرّے ذرّے سے پھوٹتی معلوم ہورہی ہے اور میں نہیں جانتا ان پھولوں کا انجام کیا ہوگا؟

راجدہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی۔ ہم ایک ایسی سڑک پر سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف جامن کے سایہ دار درخت تھے۔ اور بجلی کے لیمپ کافی جگہ چھوڑ کر لگائے ہوئے تھے۔ چلتے ہوئے کبھی ہم اندھیرے میں گھر جاتے اور کبھی روشنی میں نکل آتے۔ ہوا کے نرم جھونکے ہمارے قریب سے کبھی رات کی رانی اور کبھی چنبیلی اور گلاب کی خوشبو لئے گزر جاتے۔ اب فضا میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔

"راجدہ سردی تو نہیں لگ رہی؟"

"بالکل نہیں ـــــ آج تو میرے ہاتھ بھی گرم ہیں"۔

یہ محبت کی گرمی ہے راجدہ' میں نے اس کے نرم اور نیم گرم ہاتھ دبا کر کہا۔ اور راجدہ مسکرانے لگی۔ ہم پھر اندھیرے کی غار میں سے گزر رہے تھے۔ مگر راجدہ کے سنہری جھومر کی چمک یہاں اور تیز ہو گئی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور ایک کلب گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے ہمیں مردوں کے قہقہوں اور بلیرڈ کی چھڑی کے گیند سے ٹکرانے کی آوازیں سنائی دیں۔

گنبد والے ریڈیو پر اُردو کے بعد انگریزی میں خبریں سُنائی جا رہی تھیں۔ اور پلاٹ کے بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ بہار کی چمکیلی رات کے گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کے کافوری فانوس جا بجا روشن تھے۔ ایک طرف سات ستاروں کی ٹولی سفیدے کے چھریرے درختوں پر سے جھانک رہی تھی۔ شبنم آلود گھاس پر سے گزر کر ہم اپنے پسندیدہ پلاٹ کے وسط میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ پلاٹ کی عام سطح سے نیچی تھی اور حوض کے مانند بنی ہوئی تھی۔ ہمارے دائیں بائیں نصف دائرے کی شکل میں پھولوں بھرے پودوں کی کیاریاں تھیں، جن میں قرمزی، نیم گلابی، گہرے زرد اور برف ایسے سفید اور کاسنی رنگوں کے چھوٹے چھوٹے بے شمار پھول اوس میں بھیگے ہوئے تھے، کبھی کبھی نہر کی طرف سے کناروں پر اگی ہوئی منک کی تیز اور مرطوب بو بھی آجاتی تھی۔ سامنے والے باغ میں آڑو اور آلوچے کے درخت قطار در قطار، سفید شگوفوں سے لدے ہوئے تھے۔ کلب گھروں کے روشن دانوں میں سے زرد زرد روشنی جھانک رہی تھی۔ دفعتاً نہر والے درختوں کے عقب میں مدھم روشنی کا غبار سا اُٹھا جو لحہ بہ لحہ پھیلتا گیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں درختوں کے اوپر زرد چاند کا پژمردہ چہرہ نمودار ہو گیا ـــــ اس کی سوگوار

بلکہ میں باغ کی ہر شے افسردہ اور ملول سی نظر آنے لگی۔ ادھر ادھر پھل دار باغات
لے ذخیروں میں پرندوں کی پیاری پیاری آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جیسے وہ
چاند کے استقبال کا گیت گا رہے ہوں۔ راجدہ سیاہ برقعے میں اپنا آپ لپیٹے
مرمریں بنچ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کا سر میرے زانو پر تھا۔ اور میری انگلیاں اس کے
سنہرے جھومر سے کھیل رہی تھیں جو دھندلی چاندنی میں، شام کے ستارے کے مانند
کبھی نیلی اور کبھی سرخ چمک دے رہا تھا۔ راجدہ نے میری طرف آنکھیں اٹھا کر کہا۔
"مجھے ڈر لگتا ہے!" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔
"مجھ سے!"
"ہاں —— کہیں تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ تو نہیں دو گے؟"
"کبھی نہیں راجدہ!"
"سچ میں اس وقت مر جاؤں گی!"
"او —— کبھی نہیں، کبھی نہیں راجدہ" اور میں نے شام کے ستارے کو چوم لیا۔ اور پھر
راجدہ کے نرم بالوں سے کھیلتے کھیلتے، راجدہ سے بے خبر میں اپنی تنہائی اور خاموشیوں کے
رنگے سمندروں کی نچلی تہوں میں اتر گیا۔ اور وہاں میں نے سیدھا پتھروں کی درزوں میں
ایسے انمول موتیوں کی ڈھیریاں دیکھیں جو دنیا کی کسی کان میں نہ تھے۔ اور چمکیلی بیلوں پر
جھومتے ہوئے ایسے پھول دیکھے جو دنیا کے کسی باغ میں نہ تھے۔
ہم پلاٹ سے نکل کر سڑک پر آئے تو ہال دروازے والی گھڑی نے رات کے گیارہ کا
بجایا۔ اب ٹھنڈی ہوا سارے باغ میں چل رہی تھی۔ اور چاند کافی اوپر آ گیا تھا۔
رے سامنے سڑکوں پر دور تک درختوں کے جھومتے ہوئے سایوں کے سوا اور کچھ بھی
تھا۔ ہمارے کپڑے اوس میں تم آلود تھے۔ راجدہ کا سیاہ نقاب ہوا میں لہرا رہا تھا اور
خود وہ یوں چل رہی تھی جیسے ابھی ابھی ہلکی شراب کا ایک پیگ لگا کر اٹھی ہو۔

جس وقت ہم اپنی گلی میں پہنچے تو قوالی ہو رہی تھی۔ راجدہ کو بڑی آپا اور امی کے پاس پہنچانے کے بعد سگریٹ سلگایا۔ اور اپنے دوستوں کی ٹولی میں جا بیٹھا۔ ابھی میں پہلا ہی کش لگا رہا تھا کہ خوب صورت قوال نے مجھے نیم وا نگاہوں سے دیکھ کر مصرعہ اُٹھایا۔ ؎ سہانی رات تھی اور پُر سکوں زمانہ تھا

مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری اور راجدہ کی ملاقات کا حال بیان کرنے لگا ہے۔ جیسے وہ ابھی کہے گا۔ ؎ سہانی رات تھی اور پُر سکوں زمانہ تھا۔ اور راجدہ اپنا سر اپنے محبوب کے زانو پر رکھے کمپنی باغ کے پلاٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ابھی ابھی کمپنی باغ سے واپس آئے ہیں۔ راجدہ اوپر چلی گئی ہے اور اس کا محبوب وہ سامنے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے ـــــ میں گھبرا سا گیا ـــــ مگر خیریت گزری کہ دوسرا مصرعہ کچھ اور تھا۔ صبح نہایت روشن اور شاندار تھی۔ نیلے اور پُر نور آسمان پر سپید کبوتروں کی ٹولیاں چکر لگا رہی ہیں۔ راجدہ دیر تک سوتی رہی۔ اس دوران میں میں صبح کی سیر سے واپس آ چکا تھا۔ اور میرے ہاتھ میں اصلی گلاب کے شبنم آلود سُرخ پھول تھے جن سے بڑی فرحت بخش شیریں خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں راجدہ کی طرف گیا۔ وہ گرم چادر میں منہ سر لپیٹے بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے آہستہ سے چادر کھسکائی اور پھول اس کے منہ پر ڈال دئے۔ اور تیزی سے باہر آ گیا ـــــ تھوڑی دیر بعد وہ پھولوں کا گلدستہ پکڑے۔ نیند میں شرابور نیم وا آنکھیں۔۔ رومال سے منہ پر پڑی شبنم پونچھتی باورچی خانے میں داخل ہوئی جیسے وہ بہار کی دیوی ہو اور اپنے عہد محبت کی نشانی لئے خیابانوں سے رخصت ہو رہی ہو۔

"پھولوں کی شہزادی" چھوٹے بھائی نے کہا۔ وہ پچھلے روز اسی نام کی ایک کتاب اسکول سے لایا تھا۔ امی' بڑی آپا اور چھوٹی بہنیں ہنس پڑیں۔ اور چھوٹا بھائی اور راجدہ شرما گئے۔ باورچی خانہ چونکہ کافی کھلا اور روشن تھا۔ اور موسم

سرما کی بھی آمد آمد تھی۔ چنانچہ صبح کی چائے یہیں اڑا کرتی تھی۔
"بھئی خواہ کچھ ہو، میں تو راجدہ کو اپنے پاس ہی لے آؤں گی"۔ امی نے راجدہ کے پیالے میں ملائی ڈالتے ہوئے کہا۔ راجدہ نے سر جھکالیا۔ آپا بولیں۔
کیوں نہیں، اور اس سے زیادہ اچھی بھابی ہمیں کہاں ملے گی۔ اور راجدہ نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ اس کی خوب صورت مخروطی انگلیوں میں سنہری انگوٹھیوں کے سفید نگینے آگ کی روشنی میں دمک اٹھے اور پھر باورچی خانہ حجلۂ عروسی بن بدل گیا۔ اور ایک نیم روشن خوشبوؤں بھرے کمرے میں سیج پر چنبیلی اور موتیا کے بے شمار پھول بکھر گئے۔ دلھن کا عروسی جوڑا پہنے، سنہری جھومر پیشانی پر لگائے، سولہ سنگار سے آراستہ ہو کر سیج پر چھوئی موئی سے بیٹھ گئی اور میں سیج کے قریب آیا۔ اور راجدہ نے جلدی سے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور اس کی حنائی لنگوئی مخروطی انگلیوں میں انگوٹھیوں کے نگینے ستاروں کی مانند دمکنے لگے راجی نے کہا۔
پر یہ کہیں ٹک کر بھی کام کرے۔ امی کا یہ جملہ ساکن جھیل میں پھینکا ہوا پتھر تھا۔ جو میرے سنہری خواب کی لہروں کو مجھ سے دور لے گیا۔ اور میں خود باورچی خانے میں تھا۔ امی میری پیالی میں چائے ڈال رہی تھیں۔
دوپہر کے کھانے کے بعد، میں راجدہ اور بڑی آپا دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ آپا گلی والی چھت کے قریب بیٹھی سوئٹر بُن رہی تھیں۔ اور راجدہ میری میز کے قریب آرام کرسی پر نیم دراز نغمۂ حرم پڑھ رہی تھی۔ میں سگریٹ سلگائے کبھی کچھ لکھ رہا تھا اور کبھی راجدہ کے چہرے کو تکنے لگتا تھا۔ جہاں اختر شیرانی کی نظموں کا مطالعہ اس دل فریب حسن پیدا کر رہا تھا۔ بڑی آپا بولیں "چلو راجدہ، فہمیدہ سے مل آئیں"۔
فہمیدہ بڑی آپا کی گہری سہیلی تھی۔ ان کا مکان گلی ہی میں تھا لہذا اس نے راجدہ کو آکر لے جانے کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ راجدہ تیار ہو گئی اور میں نے قلم میز پر رکھ دیا۔

"جلدی لوٹ آؤں گی۔" راجدہ نے برقعہ پہنتے ہوئے کہا۔ میں نے دراز میں سے موم بتی نکا
اور اسے روشن کر کے میز پر لٹکا دیا۔ اسے بجھنے مت دینا۔ راجدہ ہنس پڑی۔
یہ تو آدھی بھی ختم نہ ہو گی۔ کہ میں آجاؤں گی۔ اور وہ روشن موم بتی
دیکھ کر جس تیزی سے آپا کے ہمراہ چق اٹھا باہر نکلی۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ گویا
فہمیدہ کے مکان کو ہاتھ لگا کر واپس آجائے گی۔ اور مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔ جب بڑی آپا
بازار سے کوئی چیز خرید کر لانے کے لئے بھیجنے لگتیں تو وہ زمین پر تھوک کر کہتی۔
"دیکھتی ہوں کہ یہ پہلے سوکھتی ہے کہ تم پہلے آتے ہو۔"
اور میں لپک کر دوکان دار کے پاس پہنچتا۔ جلدی جلدی سودا خریدتا
گھر میں داخل ہو کر سب سے پہلے تھوک کو دیکھتا کہ کہیں سوکھ تو نہیں گیا۔
بڑی آپا تھوک کر بھول گئی ہوتی تھیں۔
میز کے کنارے پر ٹکی ہوئی موم بتی لمحہ بہ لمحہ پگھل رہی تھی۔ گرم موم کے ننھے
شفاف قطرے دلہن کے آنسوؤں کی مانند بہہ رہے تھے سگریٹ سلگائے میں بڑ
اشتیاق سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ میرا سگریٹ بھی موم بتی کے ساتھ ہی سلگ
تھا۔ سگریٹ میں سے نیلے دھوئیں کی پتلی دبلی لکیر اٹھ رہی تھی۔ اور موم بتی میں
ننھا سا شعلہ ـــــ ایک کے پاس دھواں اور راکھ تھی۔ اور دوسرے کے پاس
اور آنسو۔ موم بتی قریب الختم تھی۔ میں یوں مضطرب اور پریشان تھا۔ جیسے اگر موم بتی بجھ گئی
راجدہ کبھی میرے پاس نہ آئے گی۔ اور میں اس کے رخساروں کے گرداب تم کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔
موم بتی کا زرد شعلہ بھڑکا اور ڈوب سا گیا۔ جس طرح میدان جنگ
ڈھلتی دھوپ کی سرخی میں کسی سپاہی کے بلند ہوتے ہوئے نیزے کی انی ا
چمک کر بجھ جائے اور موم بتی بجھ گئی اور راجدہ نہ آئی۔ میں نے سگریٹ کی گ
راکھ دان میں مسل کر پرانی موم بتی کی لاش پر نئی موم بتی روشن کی اور سگر

سلگا کر بیٹھا رہا ـــــ تھوڑی دیر بعد گلی والوں کی امازے کی چق اٹھی اور راجدہ جلدی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا جیسے وہ بھاگتی ہوئی آ رہی ہو۔

"ابھی نہیں بجی"، دیکھا میں کتنی جلدی آ گئی"۔

میں نے راجدہ کو ایک لمحہ کے لئے دیکھا اور چپکے سے سر جھکا لیا۔ وہ برقعے کے بٹن کھولتی ہوئی میری طرف بڑھی۔

"چپ کیوں ہو گئے ؟"

"کچھ نہیں ـــــ یہ دوسری موم بتی ہے۔ پہلی بجھ گئی تھی"۔

"تو اپنی موم بتی کے پیسے لے لو"۔

یہ اس نے کچھ ایسے پیارے انداز میں کہا کہ ہم اپنی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

"سچ بڑے اچھے لوگ ہیں وہ ـــــ مجھے اٹھنے ہی نہ دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے بھاگ کر آئی ہوں"۔

آپا کہنے لگیں۔ میں ذرا دیر بعد آؤں گی۔ میں نے کہا بھئی میں تو چلتی ہوں، ـــــ اس دوران میں راجدہ نقاب ایک طرف رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

موم بتی کی نرم روشنی میں اس کے چہرے کے نقوش بڑی خوب صورتی سے اجاگر ہو رہے تھے۔ اس کا چہرہ سنہری جلد والی ایک کتاب تھا جو محبت بھرے روشن اور مقدس اشعار سے لبریز ہو۔

موم بتی کی دھیمی روشنی میں ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہماری آوازیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ تھیں ـ ان لہروں کی مانند جو پُر اسرار چاندنی میں بڑی خاموشی سے پُر سکون ساحلوں کی طرف سمٹ رہی ہوں۔

ایک ہی چشمے سے نکلتی ہوئی دو ندیاں، جو پہاڑی کی مرطوب چٹان میں

جاکر آپس میں مل کر بہنے لگی ہوں۔ ایک ہی ڈالی کے دو شگوفے جو ایک ساتھ کھلیں اور جنھیں ایک ساتھ مرجھا کر جھڑ جانا ہو۔

ہم الفاظ کی موسیقی سے کھیل رہے تھے۔ جس طرح موسم بہار میں کم سن بچے پھولوں سے کھیلتے ہیں۔ راجدہ کے چہرے کے گرد روشنی کا پُرنور ہالہ تھا۔ اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے راجدہ آگ کا ایک ذرّیں شعلہ ہے۔ جو شام کے وقت کسی کھلے میدان کے وسط میں روشن ہو۔

جب ہم خاموش ہو جاتے تو اس میں اپنے کہے ہوئے الفاظ دیوان خانے کی نیم روشن فضا میں جگنوؤں کی مانند رہ رہ کر چمکتے دکھائی دیتے پھر ہماری گفتگو خاموش اور بے زبان گفتگو میں بدل جاتی۔ ہم ایک دوسرے سے درختوں پھولوں۔ ستاروں اور آبشاروں کی زبان میں باتیں کرتے۔

یہ گھنے جنگلات اور تاریک راتوں کی گفتگو تھی۔ جو دن نکلنے پر اپنے پیچھے روشنی اور شبنم کے آنسو چھوڑ جاتی ہے۔ پھر دن نکل آیا اور راجدہ لاہور چلی گئی۔

لاہور پہنچنے کے بعد راجدہ مجھے برابر خط لکھتی رہی۔ جنوری کا آخر تھا کہ راجدہ کا ایک خط آیا۔

"میرے پردیسی ...... مجھے معاف کرنا کہ میں تمھارے خط کا جواب دیر سے لکھ رہی ہوں۔ میرا چچازاد بھائی سعید برما سے اچانک واپس آگیا ہے اور گھر پر چونکہ رشتہ داروں کی آمد و رفت رہی اس لئے اتنی فرصت نہ مل سکی کہ تمھیں اطمینان سے بیٹھ کر خط لکھتی۔ سچ مجھے بڑا افسوس ہے، پتہ نہیں تم کیا خیال کرتے ہوگے

راجدہ کا اندازہ درست تھا۔ سعید کے بارے میں مجھے طرح طرح کے غیر خوشگوار خیالات نے گھیر رکھا تھا۔ اگرچہ میں اس کے متعلق اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ راجدہ کا چچازاد بھائی ہے اور تین سال سے برما میں ہے۔ پھر بھی میرے

ں بھنک ضرور پڑ چکی تھی کہ سعید کی مرحوم ماں راجدہ کو اپنے بیٹے کے لئے مانگ
ہے۔ اب مجھے بار بار سعید کا خیال آتا اور ہر بار مجھے یہی محسوس ہوتا جیسے
ان دیکھا ہاتھ بڑی خاموشی سے میرے دل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے
ل ہی خیال میں کئی دفعہ راجدہ کو سعید کے پاس بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں
تے دیکھا۔

اور ایک ہفتہ بعد جب میں راجدہ کے ہاں گیا تو راجدہ تولیہ اور صابن دانی
لئے سعید کا منھ دُھلا رہی تھی۔ مجھے اچانک اپنے بالمقابل دیکھ کر راجدہ کا
رہ ایک دفعہ زرد ہو کر جیسے ڈوب سا گیا۔ راجدہ کے بھائی وہیں بیٹھے تھے۔
راز ان میرا تعارف کرایا گیا۔ سعید خندہ پیشانی سے مجھے ملا۔ راجدہ اوپر
چکی تھی۔ سعید ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ راجدہ کے بھائی کیرم بورڈ کھیل رہے
، اور میں آرام کرسی میں دھنسا خاموشی سے سگریٹ پی رہا تھا۔ عظمیٰ اور اختر
رہ باورچی خانے میں تھیں۔ کبھی کبھی عظمیٰ کی دبی دبی ہنسی اور اختر کی گفتگو کی
م آواز آجاتی تھی۔ راجدہ اوپر تھی اور میں کمرے میں خاموش اور اداس اداس
ا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا۔ مگر راجدہ ایک بار بھی پھر
ے سامنے نہ آئی۔

اس گھر میں سالوں کی گرویدگی اور محبت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے
ل کی ہر شے بے رخی سے منھ پھیرتی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں اجنبی ہوں
ر ان کی منشا کے خلاف وہاں آن بیٹھا ہوں۔

مجھے اپنا جسم خود اپنے آپ پر ایک ناقابل برداشت بوجھ معلوم ہونے لگا۔ میں اُٹھا
ر چپکے سے راجدہ کے گھر سے باہر نکل آیا۔

باہر لوگ آرہے تھے اور جا رہے تھے ــــــ کئی ایک نے میری طرف حیرانگی اور

دل چسپی سے دیکھا. جیسے میں کوئی بہروپیا ہوں اور بھیس بدل کر ان کے در
آگیا ہوں۔ جیسے وہ مجھے پہچان بھی چکے ہیں۔ اور میرے بہروپ پر حیران ہو ر
ہیں۔ بازار میں چلتے چلتے کئی بار میرے قدم لڑکھڑائے اور میں گرتے گرتے سنبھ
ایک ہوٹل کے قریب پہنچ کر میں اندر گھس گیا لیکن چائے کا آرڈر دیے بغیر
باہر نکل آیا۔

میری حالت کسی ایسے گویئے کی سی تھی جو بھری محفل میں گاتے ہوئے اچ
بے سُرا ہو گیا ہو۔

میں امرتسر چلا آیا۔ اپنے دیوان خانے میں پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا
میں بیچ بازار میں ننگا ہو گیا تھا۔ اور میرے اوپر کسی نے چادر ڈال دی ہے۔
میز پر پڑی ہوئی کتابوں کے پاس پھول دان میں گلاب کے پھول مرجھا رہے
کونے میں میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے بنی ہوئی آئل پینٹ تصویر پر گرد
جم رہی تھی۔ اس تصویر میں سوکھے ہوئے درختوں کی بے برگ ٹہنیوں کے عقب میں
رنگ کے جل تھل کرنے والے بادل دکھائے گئے تھے۔ اور نیچے لکھا تھا۔ "ذرا عمر
کو آواز دینا"........

میں نے اس تصویر کو لے کر رومال سے اس پر جمی ہوئی گرد صاف کی اور
دل بھر آیا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "ذرا عمر رفتہ کو آواز د
......" اور میں نے تصویر کو سینے سے لگا لیا۔ کتنی ہی دیر تک راجدہ کا غم آنسو
میری آنکھوں سے بہتا رہا۔ اور جب میں نے تصویر کو دوبارہ میز پر رکھا اور
اپنا آپ اس بچے کی مانند مسرور اور ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اسکول
دروازے پر پہنچ کر خبر ملے کہ آج چھٹی ہے......

دوسرے مہینے کے وسط میں راجدہ کا خط آیا۔ کہ اس کے والدین ا

شادی سعید سے کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس نے زہر منگوا کر اپنے پاس رکھ لیا۔
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ راجدہ کا ایک اور خط آیا۔..... "خدا کے لئے مجھے بتاؤ میں مر جاؤں گی پردیسی"

میں کیا کرتا ـــــ میں نوکری چھوڑ بیٹھا تھا۔ کس برتے پر راجدہ کو بچاتا۔ میں نے امی سے بات کی کہ اگر راجدہ مجھے مل جائے تو میں نوکری کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ وہ مان گئیں۔ مگر ابا نے کہا۔ کہ وہ لڑکی والوں سے صاف صاف کہہ دے گا کہ لڑکا نکما ہے ـــــ راجدہ مجھے برابر لکھتی کہ نوکری کر لو۔ پھر ہم شادی کر لیں گے۔ پھر ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہ کر سکے گی ـــــ میں نے سر توڑ کوشش کی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جب راجدہ کے بچھڑ جانے کے بعد مجھے ایک کالج کی لائبریری میں پچاس روپوں کی جگہ مل گئی۔ اس رات میں خوشی سے بالکل نہ سو سکا۔ تمام رات بستر میں لیٹا بیداری کے خواب دیکھتا رہا۔ راجدہ بھاری کامدار ریشمی لباس میں ملبوس پھولوں میں بسی دلہن بنی میرے ساتھ سمٹی ہوئی بیٹھی ہے۔ باریک ریشمی گھونگھٹ میں سے مجھے اس کے ریشمی رخسار دمکتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔ ہمیں راجدہ کی شریر اور چنچل سہیلیوں نے گھیر رکھا ہے۔ کوئی پان پیش کر رہی ہے اور کوئی دودھ کا گلاس پلانے پر تلی کھڑی ہے مگر میں انکار کر رہا ہوں کیونکہ مجھے پتا ہے کہ پان میں سپاریوں کی جگہ روڑے اور دودھ میں چینی کی جگہ نمک کا ڈبہ انڈیل دیا گیا ہے ـــــ

پھر میں نیچے جانے کے لئے اٹھا ہوں اور میرے ساتھ تکیہ بھی اٹھ آیا ہے۔ کیونکہ اسے میرے کوٹ کے ساتھ چپکے سے چمٹا دیا گیا ہے۔ میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے اور میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔ میں جوتا ڈھونڈ رہا ہوں اور جوتا نہیں مل رہا.....

پھر جیسے کسی باغ میں پھولوں بھری بیلوں اور گنجان درختوں کی پرسکون چھاؤں میں راجدہ میرے قریب بیٹھی اون اور سلائیاں لئے کچھ بن رہی ہے۔ میں گھاس

پر تیم دراز ہوں۔ ہمارے پاس ہی ایک بڑی ہی پیاری بچی پھولوں اور گھاس پر گرے پڑے پتوں سے کھیل رہی ہے۔ کبھی راجدہ اور کبھی بچی کو دیکھ رہا ہوں۔ اور آسمان پر موسم بہار کی شام کی سنہری چمک پھیل رہی ہے۔

اور پھر دن نکل آیا۔ اور اسی دن میں امیدوں اور ارادوں سے بھرپور دل لئے راجدہ سے ملنے گیا۔ ایک بازار کا موڑ گھومتے ہی مجھے سامنے راجدہ کا بھائی آتا نظر آیا۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے راجدہ خود چلی آرہی ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں آگے گلے سے لگالوں۔ قریب پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔

"بھئی کل شام دفتر سے نکل کر گھر ضرور پہنچ جانا۔"

"کوئی محفل سرگرم ہو رہی ہے کیا؟" میں نے اپنے جسم میں مسرتوں کے غبارے ابھرتے محسوس کیے۔

"یہی سمجھ لو۔" اس نے حسب عادت مسکراتے ہوئے کہا۔ "سعید کا نکاح ہو رہا ہے"

"کہاں؟" میرے منہ سے خود بخود نکل گیا لیکن مجھے اب تک یاد نہیں کہ میں نے ایسا کہا۔

"گھر ہی میں ——" ویسے تم ضرور پہنچ جانا۔"

"ضرور" —— اور وہ چلا گیا اور مسرتوں کے غبارے یکے بعد دیگرے پھٹتے چلے گئے اور میں نہ راجدہ کے گھر کی سمت بڑھ سکا اور نہ وہاں کھڑا ہو سکا۔ بازار میں ہر شے سے بے خبر، میں سر جھکائے، ہاتھ لٹکائے یوں چلا جا رہا تھا۔ جیسے میں نے جوان بھائی کو قبرستان میں دفنا کر آ رہا ہوں۔

راجدہ سعید سے بیاہی جا رہی تھی۔

وحشی اور ظالم لوگوں سے بھری ہوئی ریل گاڑی سے نکل کر میں نے نرم دل گارڈ کے ڈبے میں پناہ لی تھی۔ اور نرم دل گارڈ نے مجھے بڑی محبت سے سگریٹ پیش کرنے کے بعد ڈبے سے باہر نکال دیا تھا۔ اور میں پھر انہی لوگوں کے اژدحام میں تھا

ہا اور بے یار و مددگار۔

گھر پہنچ کر میں تمام رات سگریٹ پیتا اور بڑے تحمل سے راجدہ کے بغیر بسر ہونے
اپنی زندگی کے نشیب و فراز گنتا رہا۔ راجدہ کے بغیر میں اپنی زندگی کا کوئی آخری نقشہ
م کرنے سے بالکل قاصر تھا ـــــ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ میں کسی اجنبی اور
اقف شہر کے اَن دیکھے بازاروں میں یونہی آوارہ اور بے مقصد گھوم رہا ہوں۔
ر لوگ اپنی اپنی دوکانیں اور کاروبار بند کر کے گھروں کو جا رہے ہیں۔ اور کبھی
ے اپنی دونوں طرف ویران اور اجاڑ کھنڈرات کا ہیبت سلسلہ حدِ نگاہ تک
یلا معلوم ہوتا۔ اور میں چلا جا رہا ہوں ـــــ کہاں؟ کدھر؟ کوئی خبر
یں ـــــ

راجدہ میرے لئے روشنی کا مینار تھی جسے دیکھ کر بھولے بھٹکے جہاز راں رستے
ا درست سمت اور خطرے سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مگر اب اس مینار کی روشنی دھند کے
یز غلاف میں لپٹی ہوئی تھی۔ اور مجھے ہر قدم پر خطرے اور گمراہی کا احساس
رہا تھا۔ راجدہ کو اپنے قریب پا کر مجھے اپنے تئیں ایک ایسے پہاڑ کا احساس
تا جس کی چوٹی پر سورج طلوع ہو رہا ہو۔ لیکن اب یہ سورج غروب ہو رہا تھا۔
ر میرے دامن کی بستیوں میں شام کے تاریک سائے پھیل رہے تھے۔

راجدہ کا خیال مجھے ہر شے سے الگ تھلگ ہونے پر اکساتا تھا اور سب سے
ا ہو کر میں کئی بار ـــــ راجدہ کے خیال سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ مگر آج ناامیدی
خاموشی کے اس پُل پر میں اکیلا کھڑا اپنے نیچے بہنے والی تنہائی اور درد کی تاریک
کو تک رہا تھا۔ جہاں راجدہ کی کانپتی ہوئی مدھم سی شبیہہ سرمئی دھندلکوں
آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہی تھی۔

شام کے وقت میں گھر سے نکلا اور کمپنی باغ کی طرف چل پڑا۔

باغ میں دھوپ ماند پڑ رہی تھی۔ کہیں کہیں ڈھلتے سورج کی سُرخی درختوں کے تنوں پر چمک رہی تھی۔ ہلکی سرد ہوا میں درختوں پر سے سوکھے پتے جھڑ جھڑ کر گر رہے تھے۔ سڑک پر گرتے ہی وہ کچھ دور تک لڑھکتے اور پھر جیسے بے جان سے ہو کر رہ جاتے۔

پردہ کلب کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے راجدہ، عظمی اور بھابھی اور بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے وہ اندر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ پلاٹ کے وسط والا آم کا گنجان درخت خاموش محافظ کی مانند کھڑا تھا۔ اور زرد زرد گھاس پر خالی ڈبیاں اور چوسی ہوئی گنڈیریوں کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔

سڑک پر گرے ہوئے سوکھے پتوں کو روندتا میں اس پلاٹ میں داخل ہوا جہاں ہماری محبت نے پہلی بار رنگ برنگ پھولوں اور پتوں میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں مرجھائے ہوئے پودوں کی قطاریں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ چھت والے گلاب کی بیلیں سوکھ رہی تھیں۔

"راجدہ دیکھ کر چلنا کہیں کانٹا نہ چبھ جائے!" یہ بھابھی کی آواز تھی۔

"اوئی پانی بڑا ٹھنڈا ہے تم بھی آجاؤ"۔۔۔ یہ راجدہ کی آواز تھی۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ساٹن کی شلوار کے پائنچے اٹھائے پلاٹ کے پانی میں چل رہی اب وہ میرے قریب کھڑی سینڈل کے تسمے باندھ رہی تھی اور فضا میں اُس کے خوشگوار پسینے اور حنا کی خوشبو پھیل رہی ہے۔ اور وہ بھابھی سے کہہ رہی ہے۔۔۔ جی یہ ایسی راتیں باغوں میں گزارنا چاہتی ہوں۔ بس پائنچے اٹھائے پانی میں گھومتی پھرتی رہوں۔ اور جب تھک جاؤں تو۔۔۔۔۔۔

ہم کرسٹل میں آگئے ہیں اور راجدہ کیبن کے شیشوں میں سے مجھے پہلی بار۔

پاک اور بے لوث نظاروں سے تک رہی ہے ......

اور راجدہ نے نقاب اُٹھا لیا ہے ـــــ کالے نقاب میں اس کا سپید
ـــــ جیسے تاریک رات میں کسی خانقاہ کا کُھلا ہوا روشن طاق ......
وہ کہہ رہی ہے "میں ڈرتی ہوں کہیں تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ تو نہ دو گے؟
میں مرجاؤں گی۔"

" او ـــــ کبھی نہیں، کبھی نہیں راجدہ!"

اور میں غم سے نڈھال ہو کر سنگین بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے اوپر گلاب کی پژمردہ
بیلیں جھالر تھے۔ میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا اور راجدہ ـــــ
نہیں کبھی نہیں اور پھر رِم جھم رِم جھم ـــــ مدھم بارش کی غمگین موسیقی اور سیا
ہ پر سے رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر پھسلتے ہوئے پتھروں کے آنسو ـــــ

گئے روندے پتھر پہاڑاں دے

میں پلاٹ سے باہر نکلا تو سبز اور نیلے آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہوا
تھی اور باغ کے گنجان درخت یوں خاموش اور متفکر کھڑے تھے جیسے وہ
ن فرشتے ہوں۔ اور راہ میں کھڑے کسی بزرگ کے جنازے کا انتظار کر رہے ہوں۔

- - - - - - - - - - -

وقت کا نہ رکنے والا چکر گھومتا گیا۔

میں نے راجدہ کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ کچھ عرصے تک راجدہ کے دُکھ بھرے
ملتے رہے لیکن میری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے بھی خط لکھنے بند
یئے۔ میرا زیادہ وقت لائبریری میں گزرتا تھا۔ دنیا کے بہترین مصنفوں کی
نے میرے دل و دماغ کو روشنی اور سکون عطا کیا۔

تم قسم کی تصانیف سے بھری ہوئی لمبی لمبی الماریوں کے پاس ناؤسٹ

جین ایر، سلامبو اور پیام مشرق پڑھتے پڑھتے جب کبھی مجھے راجدہ کا خیال آتا تو میں اپنے آپ سے شرمسار سا ہو جاتا۔ جیسے وہ کوئی لڑائی، مار کٹائی والی فلم ہو، جسے میں نے کبھی بڑے شوق سے دیکھا ہو ــــ پھر بھی کسی وقت جب بارش موسلادھار ہو رہی ہوتی تو میں لائبریری کی بالکونی میں کھڑا نیچے کالج کے پلاٹ میں ننگے بچوں، سرسبز گھاس اور عشق پیچاں کے کاسنی پھولوں کو دیکھتے دیکھتے محسوس کرتا جیسے راجدہ مجھ سے جدا نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی میرے قریب اس بالکونی میں کھڑی گرتی بارش میں پلاٹ کا نظارہ کر رہی ہے اور پھر میرا دل راجدہ کی محبت کے غیر فانی جذبات سے مالا مال ہو جاتا۔ انہی لمحات میں مجھے اپنے ارد گرد ننھی اور کمسن پریوں کے نازک پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی۔ اور میرے دل کے بھی جیسے پر نکل آتے۔ اور وہ بھی ان معصوم آسمانی روحوں کے جھرمٹ میں مل کر مصروف پرواز ہو جاتا۔ جنوری کی ایک ابر آلود شام کو ــــ جب کہ سردی اپنے جوبن پر تھی۔

میں لائبریری سے باہر نکل رہا تھا کہ راجدہ کا بھائی مل گیا۔ گرم سوٹ میں ملبوس سگریٹ سلگائے۔ اس گرم جوشی سے میری طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا ــــ

"کہاں رہتے ہیں آپ؟ کبھی ملتے ہی نہیں بھئی کوئی غلطی ہو۔۔۔۔۔"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس قہقہے کا انداز راجدہ سے کس قدر ملتا تھا ــــ ایک پل کے لئے میں کائنات کی ہر شے سے الگ ہو کر راجدہ کے خیال میں کھو گیا۔

ہم ایک قریبی چائے خانے میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی فضا ہر قسم کے لوگوں اور سگریٹوں کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ ہم نے چائے منگوائی اور کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو مدھم لیمپوں کی دھندلی روشنی میں گیلی سڑک پر جا بجا پانی کے گڑھے چمک رہے تھے۔ اور لوگ

کوٹوں اور گرم چادروں میں منہ چھپائے جلدی جلدی گزر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ بارش ایک دفعہ ہو کر ہٹی ہے۔ ہم خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ ابھی بمشکل ایک بازار ہی طے کیا ہوگا کہ پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اور جب راجدہ کے گھر والی گلی قریب آئی تو بارش یک لخت تیز ہو گئی۔ ہم لپک کر گلی میں گھسے اور ایک مکان کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو گئے۔ بارش کی چھپڑ چھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ ہم رومالوں سے اپنے اپنے کوٹوں سے بارش کا پانی پونچھ رہے تھے۔ اور اِدھر اُدھر بارش کے پرنالوں میں سے بارش کا پانی ایک مسلسل شور کے ساتھ گر رہا تھا۔ ہوا سرد ہو گئی تھی۔ گلی کے لیمپوں کی روشنی گرتی بارش کے دھندلے نقاب میں ماندسی پڑ گئی تھی۔ اور گلی میں اس سرے سے دوسرے سرے تک دھواں سا اٹھنے لگا تھا۔ راجدہ کا مکان یہاں سے تیسرا یا چوتھا تھا اس کے بھائی نے کوٹ کے کالر اٹھا کر کہا۔

"میرا خیال ہے گھر چلتے ہیں۔ یہاں کتنی دیر تک کھڑے رہیں گے۔"

اس ابر آلود رات کو، بارش کی لگاتار گونج میں کافی مدت کے بعد راجدہ کو پہلی بار دیکھنے کا خیال مجھے بڑا تسکین دِہ محسوس ہوا۔ چنانچہ تیزی سے بھاگ کر ہم راجدہ کے گھر میں داخل ہو گئے۔ دیوان خانے کی بتی روشن تھی۔ اس نے مجھے نیچے بیٹھنے کو کہا اور خود کپڑے بدلنے اوپر چلا گیا۔ میں نے دیوان خانے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

کمرے کی فضا گرم اور بےحد مہربان تھی۔ اور وہاں سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کرسیاں آتش دان کے قریب کھسکی ہوئی تھیں۔ اور آتش دان میں لکڑیوں کے جل جلنے پر دہکتے ہوئے کوئلوں کی سُرخ لو جگمگا رہی تھی۔ تپائی پر ریڈیو خاموش پڑا تھا۔ قریب ہی راکھ دان میں تازہ بجھے ہوئے سگریٹ میں سے دھوئیں کی پتلی لکیر اٹھ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ابھی کوئی وہاں سے اُٹھ کر گیا ہے۔

کمرے کا حلیہ آج سے کچھ عرصہ پہلے کی نسبت بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ فرش پر دری کے بجائے کافی بڑا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف پلنگ کے قریب نئی طرز کا سنگھار میز پڑا تھا جس پر ہر قسم کا سنگھار کا سامان چمک رہا تھا۔ سنگھار میز کے کونے میں سعید کی تصویر چاندی کے فریم میں مسکرا رہی تھی۔ پلنگ کے پاس ہی سرہانے کی طرف ایک چھوٹی سی میز پر کچھ کتابیں پیڈ اور قلم دوات اور ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا۔ کارنس کی پٹی ہلکے سبز رنگ کی ریشمی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور دونوں کناروں پر گلدانوں میں کاغذی رنگین پھول اصلی پھولوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کارنس کے اوپر وہی شیراز کے پرانے دروازوں، لمبے لمبے پُراسرار جالی دار جھروکوں اور مسجد کے دودھیا میناروں والی تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ تصویر اور ریڈیو پہلے اوپر ہوا کرتے تھے۔ مجھے یہ سوچنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ یہ کمرہ راجدہ بیگم کا تھا۔

میں نے راکھ دان میں سگریٹ مسلا اور ریڈیو کی بتی روشن کر دی۔ لاہور دلی ——— بمبئی ——— ریڈیو کی سوئی ڈائیل کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر چکی تھی۔ معاً ایک جگہ میرا ہاتھ خود بخود رک گیا۔ یہ قاہرہ تھا اور وہاں سے عربی موسیقی کا پروگرام شروع تھا۔

دف بج رہی تھی۔ اور لڑکے اور لڑکیاں مل کر گا رہے تھے۔ گیت کے بول میری سمجھ سے باہر تھے۔ مگر ان کی گہری لمبی ——— سوگوار کانپتی ہوئی تانیں دل پر برابر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ یہ تانیں لرز لرز کر دل کی گہرائیوں سے اٹھتیں اور شعلے کی مانند لپک کر پھیل جاتی تھیں۔ ان میں سادگی۔ سچائی اور تڑپ تھی۔ جب لڑکوں یا لڑکیوں کی ٹولی اپنے بول ختم کرتی تو دیر تک دف بجتی رہتی۔ جیسے کوئی بدوی کھجور کے درخت کو ہلا رہا ہے۔ اور پکی ہوئی موٹی موٹی کھجوریں زمین پر گر رہی ہوں۔ پھر لڑکیوں کی باریک آوازیں تنی ہوئی کمانوں سے نکلے

ہوئے سہری تیروں کی مانند اوپر کو اٹھتیں۔

یہ عرب کی صحرازادیوں کے گیت تھے۔ جنھیں وہ خاص خاص موقعوں پر گاتی ہیں۔ کبھی چاندنی رات میں کھجوروں تلے ٹھنڈی ریت پر محفلیں جما کر کبھی میدانِ جنگ سے لوٹتے ہوئے اپنے خاوندوں اور بھائیوں کی آمد پر، کبھی قاہرہ ریڈیو اسٹیشن پر آکر ——

دروازہ کھلا، اور راجدہ کا بھائی اور سعید اندر داخل ہوئے۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ سعید بھورے اوور کوٹ میں ملبوس تھا۔ اور راجدہ کا بھائی گرم چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

"بڑے دنوں بعد نظر آئے۔ کہیں گئے ہوئے تھے"، سعید نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھا۔

"جی نہیں۔ یہیں تھا۔ دراصل کام کی زیادتی کے باعث۔۔۔۔۔"

"بہت خوب —— آدمی کام کرتا ہی اچھا لگتا ہے"، سعید نے بوڑھوں کی مانند مجھے نصیحت کی۔ راجدہ کا بھائی سنگھار میز کی دراز دیکھ کر بولا۔

"بھئی سگریٹ ختم ہو گئے میاں!"

اور میں نے جیب سے دو مارپیٹر کا ڈبہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اور مجھے راجدہ کا خیال آ گیا —— راجدہ کہاں ہے؟ شاید اوپر سو رہی ہو گی۔ اس نے تو کہا تھا میں زہر کھا لوں گی۔ کیا اسے میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی ——؟

دروازہ پھر کھلا اور عظمیٰ اور اختر اندر داخل ہوئیں۔ اختر اپنی بچی اٹھائے ہوئے تھی اور عظمیٰ کے ہاتھ میں سلائیاں اور نصف بُنے ہوئے موزے تھے۔

"کہیں باہر گئے ہوئے تھے کیا"، عظمیٰ نے کرسی آتش دان کے قریب لاتے

ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں ——— یہیں تھا۔"

"اچھا۔"

یہ ذراسی، اچھا کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے موزے بننے لگی۔ جس طرح کوئی بچہ قلم چھڑک کر لکھنے میں مشغول ہوجائے۔ یہ اچھا، سیاہی کا ایک دھبہ تھا جو میرے کپڑوں پر چھڑکا گیا تھا۔ اختر اور سعید تیز تیز باتیں کررہے تھے۔ راجدہ کا بھائی اختر کی بچی سے کھیل رہا تھا۔ گلی میں روشن دان کے چھجوں پر گرتی بارش کا شور اندر سنائی دے رہا تھا۔ آتش دان میں آگ تیز کردی گئی۔ عظمیٰ خاموشی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ اور میں کرسی میں دھنسا خاموشی سے سگریٹ پیتے ہوئے اس کے سنہری بالوں اور سپید چہرہ کے باریک خطوط کو آگ کی روشنی میں چمکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

دفعتہً کالے کمبل میں منہ سر لپیٹے کوئی دروازے میں نمودار ہوا۔ کمبل پر بارش کے قطرے جابجا چمک رہے تھے۔ سب پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔ اس آدمی نے کمبل سے ایک ہاتھ نکال کر اسے منہ پر سے کھسکایا اور یہ "چچا" صاحب تھے۔ چچا اپنی کرنجی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

"باہر بارش نے تو برا حال کردیا ہے۔ اندر کیا خفیہ میٹنگ ہورہی ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ اور کوئی نہ بولا۔ ویسے زیر لب سبھی مسکرارہے تھے۔ چچا اتنا کہہ سنگار میز کی طرف بڑھا۔ اور اس کے درازوں میں دیر تک کچھ تلاش کرتا رہا اور کسی نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ آخر وہ خود ہی عظمیٰ کی جانب مڑا۔

"بھئی لڑکی ——— میں موم بتیوں کا ایک سالم بنڈل لایا تھا اور اسی دراز میں رکھا تھا، غائب کیوں ہوگیا؟" "آپ ہی لائے تھے آپ ہی نے رکھا تھا اور

آپ ہی جانے"۔ عظمی نے موڑے پہ بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ اور چچا زیر لب نہ معلوم کیا کیا بڑبڑاتا ہوا پھر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ سعید بولا۔

"چچا موم بتیوں کی کیا ضرورت ہے؟ چچا خاموش رہا۔ آخر اسے ایک جگہ موم بتیوں کا سالم بنڈل مل گیا اور وہ کمبل سے منہ سر لپیٹ کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"ضرورت کیا ہے بھئی! بازی لگائی ہوئی ہے اور تیل ختم ہو گیا ہے"۔ وہ باہر نکل گیا اور سب ہنسنے لگے۔

دروازہ کھلا اور ایک دبلی پتلی سی لڑکی جس کا قد انار کا بوٹا اور ہونٹ باریک اور خمار ریشمی تھے۔ دونوں ہاتھوں میں چائے کا ٹرے لئے سنبھل کر قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی۔ یہ راجدہ تھی۔

راجدہ ——— میری موم بتی! میری مری ایگزر ڈبر تھین اور میری جینی ایرا اور میرے میدان کی آگ اور میرے پہاڑ کا سورج! راجدہ نے جھک کر ٹرے میز پر رکھا اور پھلوں سے لدی ہوئی شاخ نے لچک کر زمین کو اپنے شیریں میوے پیش کرنا شروع کر دیے اور ایران کی زہرہ جمال دوشیزاؤں نے اپنے سوڈانی دف اٹھائے اور قہوہ خانے کی پُراسرار فضا میں رقص کرنا شروع کر دیا۔ پرانے قالینوں پر، مومی شمعوں کی دھیمی دھیمی روشنی میں ان کے نیم عریاں ادھ ننگے سنہری جسم بے قرار شعلوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور کم عمر خوب صورت بچے ترکی پیالوں میں گرم گرم قہوہ لئے ادھر ادھر گھومنے لگے۔ شیراز کے باغات میں چاندی کے فوارے ابل رہے تھے۔ اور مسجدوں کے دودھیا گنبدوں کے اوپر نیلے آسمان پر سپید و براق کبوتروں کی ٹولیاں محو پرواز تھیں۔ اور ملیاڈی کے خیابانوں میں پتھریلی شاہراہوں کے دونوں جانب جھکی ہوئی نرم بیلوں پر کاسنی رنگ کے انگوروں کے خوشے پک گئے تھے۔ اور ان پر سفیدی سی جم رہی تھی۔

گلمرگ کی رنگین وادیوں میں چناروں کی ٹہنیوں پر سرخ سرخ شگوفوں کی شمعیں روشن ہو گئی تھیں۔ باغات کے گھنے ذخیروں میں کشمیر کی شوخ و شنگ

سیب کے درختوں پر سے سیب اتار اتار کر اپنے ٹوکروں میں رکھ رہی تھیں۔ اور راجدہ نے ٹرے میز پر رکھ دیا۔ راجدہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس نے کسی سے بات نہ کی اس نے کسی کی طرف آنکھ نہ اٹھائی۔ راجدہ نے لکھا تھا میں زہر کھا لوں گی۔ اور راجدہ نے زہر کھا لیا تھا۔ چائے کا گرم گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے، میں نے راجدہ کی آواز سنی۔ وہ اپنی امی کو بلا رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خواب کے جزیروں سے مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ میرے دل میں ایک اجنبی اور مقدس خیال بجلی کی مانند چمکا اور میرا ذہن چکا چوند ہو کر رہ گیا۔

ایک قسم کی بزرگی، عظمت اور برتری کا خیال۔

جو بھرتری ہری کو گھنے جنگلوں میں اور موسیٰ کو آگ کی طرف کھینچتا ہوا لے گیا اور جس نے کالی داس کو میگھ دوت اور ڈانٹے کو ڈیوائن کامیڈی لکھنے پر اکسایا۔ میں نے سگریٹ آتش دان میں پھینکا اور اس خیال کی تعظیم میں میرا سر خود بخود جھک گیا جب میں گلی سے گزر رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں صد بہار در آغوش اقلیم محبت کے سنہری خیابانوں میں داخل ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر ایک ایسے بجرے کا گمان ہو رہا تھا جس کے ریشمی بادبان تنے ہوئے ہوں۔ اور جسے مشرقی ہواؤں کے مہربان جھونکے آہستہ آہستہ دور ـــــ پُرسکون جھیلوں، روشن پہاڑوں اور پھولوں کے ڈھکے ہوئے گم نام جزیروں کی طرف لئے جا رہے ہوں۔ . . .

آج راجدہ کی شادی کو تیسرا سال ہو رہا ہے۔ مگر میری راجدہ اس وقت بھی میرے پاس ہے۔ وہ ازل سے میرے پاس تھی۔ اور ابد تک رہے گی۔ اور اس کا سیدہ کی راجدہ سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح کسی قد آور درخت سے چمٹی ہوئی چمکیلی بیل رات کی خاموشی میں اپنی غذا حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح میں راجدہ کی محبت سے اپنی غذا حاصل کر رہا ہوں۔

میں اس کی محبت کو ہضم کر گیا ہوں۔ اور اس کے اجزا میرے روح و بدن میں سرائت کر گئے ہیں۔ سعید کی راجدہ کے تین بچے ہیں۔ اور اب وہ سعید کی راجدہ کم اور اپنے بچوں کی زیادہ ہے لیکن میری راجدہ صرف میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی بے لوث محبت کی تمام جائداد کا واحد مالک ہوں۔ وہ ایک سدا بہار درخت ہے جو مجھے اپنی ایک ٹھنڈی چھاؤں عطا کرتا ہے۔ ایک چشمہ ہے جس کا شفاف پانی محض میری خاطر زمین سے پھوٹتا ہے اور ایک گم نام وادی ہے جس کے نشیب و فراز صرف میرے قدموں کی چاپ سے آشنا ہیں۔

جب مشرق میں صبح ہوتی ہے تو میں اسے اپنے ساتھ کرنوں کا تاج پہنے زریں تخت پر بیٹھے اوپر کو اٹھتے دیکھتا ہوں۔ شام کے وقت جب وادیوں پر اندھیرا چھانے لگتا ہے تو ہم پہاڑ پر چڑھ کر ان کی رخصتی کا گیت ہم آواز ہو کر گاتے ہیں۔ اور جب رات کا جادو پھیل جاتا ہے تو ستاروں کے دریچے کھول کر نورانی راستوں پر سے گزرتی ہوئی میرے پاس آ جاتی ہے اور ہم تمام رات گلاب کے پیالوں میں شبنم کی شراب پیتے ہیں اور ازلی و ابدی محبت کے غیر فانی گیت گاتے رہتے ہیں۔

ہر جگہ اور ہر مقام پر ہمارے قدم ایک ساتھ اور ہم آہنگ ہو کر اٹھتے ہیں۔ اس کا خیال مجھے اپنے تئیں اس بادل کا احساس دلاتا ہے جو خشک اور بنجر زمینوں پر بارش کے موتی لٹانے کے لئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے بلند ہوا ہو۔

وہ بوڑھی ہے نہ جوان، کنواری ہے نہ شادی شدہ ——— اسے وقت کا بوڑھا ہاتھ کبھی نہیں چھو سکتا۔ وہ اس کی دسترس سے باہر، لازوال، اٹل اور غیر فانی ہے۔

وہ ہر لحظہ، ہر گھڑی، ہر پل میرے ساتھ ہے وہ اس وقت بھی میرے دل پر اپنی محبت کے نازک پروں کا سایہ کئے ہوئے ہے۔ جبکہ میں اس کی داستان قلم بند کر رہا ہوں۔

"سعید کی راجدہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور میں اس کے بارے میں کبھی کوئی افسانہ نہ لکھ سکا......"

اشفاق احمد

گڈریا

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے۔ میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا۔ کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔ اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے راٹو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ کو پرے ڈھکیلنا چاہا "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے راٹو کو گرفتار کر لیا ـــــ" س کا فارسی میں ترجمہ کرو۔"

داؤ جی کے بچے" میں نے ادنگھے ہو کر کہا۔ "آدھی آدھی رات تنگ رتے ہو ـــــ دفع ہو جاؤ ـــــ میں نہیں ـــــ میں نہیں آپ کے گھر رہتا۔ ـا نہیں پڑھتا ـــــ داؤ جی کے بچے ـــــ کتے !" اور میں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا! پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدمی نہیں بن سکے گا، پھر لوگ تیرے داؤ جی کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں آپ بھی آپ کے جاننے والے بھی...... اور میں بھی ...... میں بھی...... میں بھی!" اپنی جواں مرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی منٹوں میں گھگھی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "بس اب چپ کر شاباش ____ میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے پھر نہیں ستاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا "آج حرام زادے رانو کو پکڑ لے گئے۔ کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو۔"

"نہیں نہیں۔" انھوں نے بات کاٹ کر کہا "میرا تیرا وعدہ رہا۔ آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا ____ شاباش اب بتا۔ "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔"

میں نے روٹھ کر کہا "مجھے نہیں آتا۔"

"فوراً نہیں کہہ دیتا ہے۔" انھوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا "کوشش تو کرو۔"

"نہیں کرتا!" میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے "کارکنانِ گزمہ خانہ رانو توقیف کردند ____ کارکنانِ گزمہ خانہ، تھانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے۔ نئی ترکیب ہے۔ دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں۔ ناچار گزمہ خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤ جی نے بڑی لجاجت سے کہا۔ اب سارا فقرہ

پانچ بار کہو۔ جب پنج گانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انھوں نے مجھے آرام سے میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔ "بھولنا نہیں! صبح اُٹھتے پوچھوں گا۔"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے ادھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں ملا جی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ مگر میں صرف موٹے ماشٹر سے واقف تھا۔ جس کو ہم کدو کریلا ڈھائی آنے کہتے تھے۔ ماشٹر کے گھر کے ساتھ بکر کا ایک باڑہ تھا۔ جس کے تین طرف کچے پکے مکانوں کی دیواریں اور سامنے رُخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اونچا نیچا جنگلہ تھا۔ اس کے بعد ایک چوکا میدان آتا تھا۔ پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھری اور اس کے ساتھ گیروے رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا۔ اور قدرے تنگ ہو جاتی۔ پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی جاتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے سے قریب آتے جاتے۔ شاید ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی۔ اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلا چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جوں ہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہو گا اور میں مر جاؤں گا مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی اور ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید سی مونچھوں والا لمبا سا آدمی ہوتا۔ جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پاجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا ہم

ہوتا۔ جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوئے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹھکے بغیر گردنوں کو ذرا ذرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن میں اور میرا بھائی کٹھیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آرہے تھے تو نہر کے پل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا۔ اور اس کی سفید چٹیا میری مرغی کے پر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے سلام کیا۔ "داؤ جی سلام"۔

اور داؤ جی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "جیتے رہو"۔

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بے حد خوش ہوا۔ اور تھوڑی دیر بعد اپنی منمنی آواز میں چلایا۔ "داؤ جی سلام"۔

"جیتے رہو، جیتے رہو"! انھوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے پٹارمع سے میرے اوپر تڑ تاتے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے، کتے"! وہ چیخا۔ جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟

ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمینہ ——— "بھلا کون ہے وہ"؟

"داؤ جی!" میں نے منہ بسور کر کہا۔

"کون داؤ جی"؟ میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں"۔ میں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکواس نہ کرو"۔ میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ "ہر بات میں

میری نقل کرتا ہے۔ کتا ——— شیخی خورا۔"

میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ داؤ جی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے میرے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت تھی۔ بڑا تھا نا اس لئے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

داؤ جی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی اس لئے میں کوشش کرکے گلی میں سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انھیں سلام کرکے بڑا مزا آتا تھا اور جواب پاکر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دو چندی ہو جاتی۔ اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا ——— سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یوں ہی چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اس قدر معلوم ہو سکا کہ داؤ جی گیرو سارنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں۔ اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے اس کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا۔ مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا۔ اور میری چھوٹی سی چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گڑھے گڑھائے دو فقرے ہوتے تھے۔ "تجھے کیا اور بکواس نہ کر۔" مگر خدا کا شکر ہے میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری اسکول سے چوتھی پاس کرکے میں ایم۔ بی ہائی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا، تو وہی داؤ جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤ جی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے ہشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے۔ اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤ جی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام سے ہی پکارتا تھا۔ اس لئے وہ میرا دوست بن گیا تھا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں

دے کر پکے یار بننے کا وعدہ کر لیا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا۔ جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسانے والی دوپہر تھی۔ لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر اسکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا۔ مگر بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی۔ آگے مستطیل صحن سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ عقیق کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں۔ اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلا کر "بے بے نمستے" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی۔ اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاب کا لڑکا ہے۔" مشین رک گئی۔

"ہاں ہاں" بے بے نے مسکرا کر کہا۔ اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسی مروڑتا اور ٹیڑھے ٹیڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ گیا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" بے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر

آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے۔" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا۔

"ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا۔"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی۔ "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے داؤ جی۔" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا۔ "امی چند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے داؤ جی برآمد ہوئے۔ انھوں نے گھٹنوں تک اپنا پاجامہ چڑھا رکھا اور کرتا اتارا ہوا تھا۔ مگر سر پر پگڑی بدستور تھی۔ پانی کی ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آگئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے "ہاں بہت شکل ملتی ہے۔ مگر میرا آفتاب بہت دبلا ہے اور یہ گولو مولو سا ہے۔" پھر بالٹی فرش پر رکھ کر انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس کا مُوڑھا ایک اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انھوں نے آہستہ سے انھیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انھوں نے بالٹی سے پانی کے چلّو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی۔" میں نے ہولے سے کہا۔ "پرسوں آیا تھا۔"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتا نہیں جی ابا جی کو پتا ہے۔"

"اچھا۔" انھوں نے سر ہلا کر کہا۔ "تو ابا جی سے پوچھا کرنا — جو پوچھتا نہیں اسے کسی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انھوں نے ویسے ہی چلّو ڈالتے ہوئے پوچھا "کون سا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سیپارے کا؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی پتا نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"تِلْكَ الرُّسُلُ" انھوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ بے بے مشین چلاتی رہی۔ وہ ٹی کی نعمت خانے سے ردی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگاتی لگی اور میں جزدان ی ڈوری کو کھولتا لپیٹتا رہا۔ امی چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں تنوں ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اترتا جارہا تھا۔ معاً داؤ جی نے نگاہیں ری طرف پھیر کر کہا ——

"سورہ فاتحہ سناؤ۔"

"مجھے نہیں آتی"۔ میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"انھوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بھی نہیں جانتے؟"

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تو جانتا ہوں جی"۔ میں نے جلدی سے کہا۔

وہ مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے "ایک ہی بات ہے ایک ہی بات ہے!!" پھر انھوں نے سر کے اشارے سے کہا "سناؤ" جب میں سنانے لگا تو انھوں نے بنا پاجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا، اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا۔ اور جب میں نے وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہا تو میرے ساتھ ہی انھوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ بھی اٹھ کر مجھے انعام دیں گے۔ کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے نایا جی کو اَلْحَمْدُ سنائی تھی۔ تو انھوں نے بھی ایسے ہی آمین کہا تھا۔ اور

ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا۔ مگر داؤ جی اسی طرح بیٹھے رہے۔ با
اور بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں امی چند ایک کتاب تلاش کر کے لے آیا۔ اور جب میں
لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا "داؤ جی سلام"۔ اور انھوں نے
ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہوئے جواب دیا "جیتے رہو"۔

بے بے نے مشین روک کر کہا "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آجایا کرو"۔

"ہاں ہاں آجایا کر"۔ داؤ جی چونک کر بولے "آفتاب بھی آیا کرتا تھا"۔ پھر
انھوں نے بالٹی پر جھکتے ہوئے کہا "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور رہ گیا اور فل
کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤ جی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات سے میں
نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤ جی بڑے کنجوس ہیں۔ حد سے زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ
بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤ جی کے گھر گیا
تھا۔ اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا بے شک آفتاب
ان سے پڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے۔ مگر تیرے ابا جی ان سے بولتے
نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انھیں
پتا چل گیا کہ تو ان کے یہاں گیا تھا تو وہ خفا ہوں گے"۔ پھر اماں نے ہمدردی
کہا "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا"۔

میں ابا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤ
کے یہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے معتبری کی باتیں کرتا۔ وہ چٹائی بچھائے
کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے۔ میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا۔ اور وہ
بند کر کے کہتے "گوگو آگیا"۔ پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے "کوئی گپ سنا

اور میں اپنی بساط اور اپنی سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا اور وہ خوب ہنستے ۔ بس یوں ہی میرے لئے ہنستے ۔ حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی دل چسپ باتیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے ۔ لے ایک سوال نکال ۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی ۔ لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا تھا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں ۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں ۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھے ہوئے ہوتے کہ اگلی باتوں ' اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا ۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے ؟" چٹائی " ! میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا ۔ " اوں ہوں " ! وہ سر ہلا کر کہتے " فارسی میں بتاؤ " ۔ تو میں تنک کر جواب دیتا ۔" لو جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے " ۔ اس پر وہ چمکار کر کہتے " میں جو پڑھاتا ہوں گو لو ۔ ——— میں جو سکھاتا ہوں ——— سنو ' فارسی میں بوریا ' عربی میں حصیر " ۔ میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ۔ " بخشو جی بخشو " ۔ فارسی بھی اور عربی بھی میں نہیں پڑھنا ' جی معاف کرو ۔" مگر وہ ان سنی ایک کر کے کہے جاتے بوریا ' عربی حصیر ۔ اور پھر چاہے کوئی اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا ۔ داؤجی کے الفاظ گنتے چلے جاتے تھے ——— امی چند کتابوں کا کیڑا تھا ۔ سارے دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا ۔ داؤجی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے ۔ لیکن ان کے وارا می چند پر بھی برابر ہوتے تھے ۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا ۔ داؤجی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر پوچھا ۔" بیٹا ڈو کا ناؤن کیا ہے ؟"

اس نے گلاس کے ساتھ منہ لگائے لگائے " ڈیڈ " کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا ۔ داؤجی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے ۔ گھر میں ان کو

اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ اکیلے دادا جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے۔ قرۃ بیٹا یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تم نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کہتے سینے لکھوا دیئے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہوتا شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں!" اور دادا جی لمبی سانس لے کر کہتے۔" جاہل اس کا مطلب کیا جانیں؟ اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا۔ اور اس کے منہ میں جو کچھ آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوستے، پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی رکھتی تو دادا جی کہتے۔" ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو، تم انھیں روکو مت، انھیں ٹوکو مت، پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیر اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بُری عادت پڑ گئی۔ اور اس بُری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم احمد مرحوم ہمارے قصبے کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجہ سے تو انھیں کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے، جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے ڈبوں۔ شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تدبیر اور حضرت سلیمان کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے تھے۔ انھیں باتوں کے لئے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھنچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لئے خالی بوتلیں لادا

شیشیاں چرا کے لاتا۔ اور اس کے بدلے وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لئے دیا کرتے۔

یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انھیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ اماں میرے اس رویے سے سخت نالاں تھیں۔ ابا جی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ راتہ طلسم ہوش ربا کے ایوانوں میں بسر ہوئی اور دن کلاس میں بنچ پر کھڑے ہو کر، سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا۔ اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ، فسانہ آزاد، اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانہ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے، لیکن الف لیلہ اسکول کے ڈیسک میں بند تھی۔ آخری بنچ پر جغرافیہ کی کتاب تلے سندباد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا..... بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے سے یونی ورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی اسکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف اسکول میں بلکہ ضلع بھر میں اوّل آیا تھا۔ بلکہ چھ لڑکے فیل تھے۔ اور بائیس پاس حکیم جی کا جادو یونی ورسٹی پر نہ چل سکا۔ اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھیوں لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی۔ اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال سے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اور اب کدھر جانا چاہیئے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا۔ اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سندباد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے

مجھے ڈھونڈتی ادھر آگئیں۔ اور اباجی سے معافی لے دینے کا وعدہ کرکے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جاکر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہوگیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا کوڈو اور دیسو یب یب مسجد کے پچھواڑے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے۔ وہ لاہور میں بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دیسو یب یب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھایا جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں۔ میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو دیسو یب یب نے کہا کہ لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہئے۔ اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو چمک کر بولا "یار دیسو سب جانتا ہے۔ یہ بتا تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر دیسو سے پوچھا "انارکلی میں دفتر بنائیں گے نا؟"

دیسو نے ذرا سوچ کر کہا "انارکلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں۔" میں نے کہا۔ انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے۔ اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہوجائیں گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آ شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا: "چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔
"ہسپتال میں"۔ وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین
ں وہ بھی شامل تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں پر چڑھا۔ پھر آہستہ
ے جالی دالا دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا۔ تو وہاں ان کے علاوہ
وَجی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے داؤجی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی
یسکے بعد 'جیتے رہو' کی مانوس دعا سنی۔
"ان کو پہچانتے ہو؟" اباجی نے سختی سے پوچھا۔
"بے شک!" میں نے ایک مہذب سیلزمین کی طرح کہا۔
"بے شک کے بچے، حرام زادے' میں تیری یہ سب......"
"نہ نہ ڈاکٹر صاحب!" داؤجی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ
ہے اس کو تو......"
اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی۔ اس
ینے نے میری عزت خاک میں ملادی"۔
"آپ فکر نہ کریں"۔ داؤجی نے سر جھکائے کہا "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین
ہے اور ایک دن ......"
اب کہ ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا اور انھوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیسی
ت کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔"
"کرلے گا، کرلے گا —— ڈاکٹر صاحب"۔ داؤجی نے اثبات میں سر ہلاتے
ہوئے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں"۔
پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں سیر کو
چلتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ آؤ راستے میں باتیں کریں گے"۔

ابا جی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصے کے عالم میں اپنا رجسٹر الٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا۔ تو داؤجی نے پیچھے مڑکر کہا "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے ابھی بھجوا دیجئے گا۔"

داؤجی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے۔ نہر کے اسی پل پر لے گئے۔ جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انھوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور کہا آج سے میں تمھیں پڑھاؤں گا۔ اور اگر جماعت میں اول نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوادوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خدا تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا.........."

"مجھ سے پڑھائی نہ ہو گی۔" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہو گا گولو" انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کروں گا، روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤں گا پھر دیکھنا.........."

اب کے داؤجی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا "خدا ایک چھوڑ کے دس کاریں دے۔ لیکن ایک آن پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا نہ ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے جل کر کہا "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی میں اپنے یہاں خوش۔"

انھوں نے حیران ہو کر پوچھا "میری بھی پرواہ نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے "میری بھی پروا نہیں؟"

"او گولو میری بھی پروا نہیں؟"

مجھے ان کے لہجے پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا: "آپ کی تو بہ۔ مگر ...." انھوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے۔ اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی ؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا .... تو ـــــ تو ـــــ" انھوں نے فوراً پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا، میں حضرت مولانا کی خاک سے بدتر بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا۔" لعنت کا طوق نہ پہنتا؟ خاندان ابوجہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظر کرم۔ حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے جنتو کو منشی جینت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی، میں کہتا ہوں رحمۃ اللہ علیہ کا کفش بردار....... لوگ سمجھتے ہیں ...." داؤ جی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے، کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے۔ اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا کچھ پشیمان سا ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ "داؤ جی! داؤ جی" اور داؤ جی میرے آقا، میرے مولا، میرے مرشد!" کا وظیفہ کئے جا رہے تھے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے۔ "کیا اچھا موسم ہے۔ دن بھر دھوپ پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے"۔ پھر وہ پل کی دیوار سے اٹھے اور بولے۔ "چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے۔"

مینا جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا۔ گھسے پنساری یعنی دیسو پپ کے باپ کی دوکان سے انھوں نے گھریلو ضروریات کی چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اٹھا کر چل دیئے۔ میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا۔ مگر ہمت نہ پڑتی۔ ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی۔ اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا ابھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا۔ اور وہیں پڑھا کروں گا۔ کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہریکین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس مین بنتا اور پان پاں کرتی پیکارڈ اڑائے پھرنا میرے مقدر میں تھا گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انہیں لاہور سے پکڑ لائے۔ لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کے کون سے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا۔

داؤجی نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے مجھے تباہ کر دیا۔ مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن اسکول کی بکواس میں گزرتا اور رات، گرمیوں کی مختصر رات ان کے سوالات کا جواب دینے میں، کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے۔ اور وہ مونگ، رسول اور مرالہ کی نہروں کی بات پوچھ رہے ہیں۔ میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے تو وہ اس سوال کو دہرا رہے ہیں۔ میں نے پھر بتا دیا ہے اور انہوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ میں جل جاتا اور جھڑک کر کہتا "مجھے نہیں پتا میں نہیں بتاتا، تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے، میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر پتلیوں میں اتر جاتی۔

میں آہستہ سے کہتا "داؤجی"

"ہوں" ایک گمبھیر سی آواز آتی۔

"داؤجی کچھ اور پوچھو!"

داؤجی نے کہا "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے ——— اس کی ترکیب نحوی کرو۔"

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے۔ صبح لکھ کر بتا

روں گا کوئی اور پوچھے ؟"

انھوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا "میرا گو لو بہت اچھا ہے"۔

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا۔ بہت اچھا صفت ہے حرف ربط مل کر نیا مسند ....

اور دادا جی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ جان پدر تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بنایا کر"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لئے پوچھا "آپ مجھے جان پدر کیوں کہتے ہیں ؛ جانِ دادا کیوں نہیں کہتے ؟"

" شاباش" وہ خوش ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے۔ اور دادا بھاشا کا۔ ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بہ دن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں۔ روز بروز کہو یا دن پر دن اسی طرح سے ......"

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں الجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا کہ دادا جی اب تو نیند آرہی ہے۔

"اور وہ ترکیب نحوی" وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہے لاکھ بہانے کرتا، ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرتا۔ مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور دادا جی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا اب مجھے دادا جی بہت اچھے لگنے لگے تھے۔ لیکن ان کی باتیں جو اس وقت مجھے بُری لگتی تھیں۔ وہ اب بھی بری لگتی ہیں۔ بلکہ اب پہلے سے بھی

کسی قدر زیادہ شاید اس لئے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں۔ اور داداجی پرانے ملّائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی۔ اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی تھی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے پڑھتا رہے۔ اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لئے ان کے پاس صرف ایک ہی نسخہ تھا۔ لمبی سیر اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً سورج نکلنے سے دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے۔ اور میرا کندھا ہلا کر کہتے ”اٹھ گولو موٹا ہو گیا بیٹا“ دنیا جہان کے والدین صبح جگانے کے لئے کہا کرتے ہیں کہ اٹھو بیٹا صبح ہو گئی ہے یا سورج نکل آیا۔ مگر وہ ”موٹا ہو گیا“ کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے۔ میں منمناتا تو چمکار کر کہتے ”بھدا ہو جائے گا بیٹا تو گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا!“ اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ”داداجی خدا کے لئے بے شک صبح نہ جگاؤ چاہے مجھے قتل کر دو۔ جان سے مار ڈالو“ یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔ بے بے کو ان داداجی سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ اور داداجی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ سارا دن محلّے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داداجی کو کوسنے دئے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا غصہ آتا تھا۔ مگر دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو داداجی میری بیٹھک میں آجاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد کہتے ”غیبت کرنا بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کر دے تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں، میں میری قرۃ العین اور تھوڑا تو بھی، ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں“۔ اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا رنگ سخت کالا تھا۔ اور دانت بڑے سفید، ماتھا محراب دار اور آنکھیں چُنیاں سی۔ چلتی تو ایسی گریہ پائی کے ساتھ جیسے

مجھے بھی معاف کرے، گٹھی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ہی بُری
کہتی کہ وہ دتوں دن رو رو کر ہلکان ہوا کرتی۔ ایک امی چند کے ساتھ اس کی
تی۔ شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی
اپنے داؤ جی سے پیار نہ تھا۔ یوں تو بی بی بےچاری بہت اچھی لگتی تھی۔ مگر اس سے
بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں داؤ جی نیچے بیٹھے ہیں اور
اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک
ی" داؤ جی پڑھ نہیں رہا تنکوں سے چارپائیاں بنا رہا ہے۔"
میں غصیل بچے کی طرح مُنہ چڑا کر کہتا "تجھے کیا، نہیں پڑھتا، تو کیوں بڑبڑ
نی ہے ـــــ آئی بڑی تھانے دارنی۔"
اور داؤ جی بھی نیچے سے بانک لگا کر کہتے "نہ گو لو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے۔"
اور میں زور سے چلاتا "پڑھ رہا ہوں جی۔ جھوٹ بولتی ہے۔"
داؤ جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتے اور کاپیوں کے نیچے
پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے "قرۃ بیٹا تو اس کو نہ چڑایا کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے
یں کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔"
بی بی کہتی "کاپی اٹھا کر دیکھ لو داؤ جی! اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے
رہا تھا۔"
میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔
داؤ جی سمجھاتے کہ بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لئے کہتی ہے۔ ورنہ اسے کیا
ی ہے کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس اس کی بلا سے! اگر وہ تیری
ئی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے۔" اور داؤ جی کی یہ بات ہرگز سمجھ میں نہ آتی
میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیوں کر چاہ سکتی ہے!"

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤ جی کے ہاں سے چل د
گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر اسکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا اسکول پہ
دیا جاتا۔ اور شام کو اسکول بند ہونے پر گھر آکے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا
داؤ جی کے یہاں آجاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤ جی کے گھر پر ہی بھجوا دیا
جن ایام میں منصفی بند ہوتی، داؤ جی اسکول کے گراؤنڈ میں آکر بیٹھ جاتے اور
انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی۔ اسکول میں جو کچھ
گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے۔ پھر مجھے گھر تک چھوڑ کر خود سبر کو چلے جاتے۔ ہما
قصبے میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن ہوتا تھا۔ اور بیس دن منصف صاحب
کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن داؤ جی باقاعدہ کچہری میں گزارتے تھے۔ ا
آدھ عرضی آجاتی تو دو چار روپیہ کما لیتے۔ ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مط
کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا۔ اس کی کتر بیونت اور محلے وا
سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔ چونکہ پچھلے چند سالوں سے گھر کا
خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا اس لئے وہ داؤ جی پر اور بھی حاوی ہو گئی
ایک دن خلاف معمول داؤ جی کو لینے میں منصفی چلا گیا اس وقت ک
بند ہو گئی تھی اور داؤ جی نانبائی کے چھپر تلے ایک بنچ پر بیٹھے گڑ کی چائے پی
تھے میں نے ہولے سے جا کر ان کا بستہ اٹھا لیا۔ اور ان کے گلے میں باہیں ڈ
ہا۔" چلئے آج میں آپ کو لینے آیا ہوں"۔ انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر چ
ڑے بڑے گھونٹ بھرے۔ ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا
پ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔
میں نے شرارت سے ناچ کر کہا۔" گھر چلئے' بے بے کو بتاؤں گا کہ آ
بوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں"۔

داؤ جی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی
۔ اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کر
ا ہے۔ تم اپنی بے بے سے نہ کہنا، خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کردے گی۔" پھر انھوں نے
ۓ زدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا "اس کی تو فطرت ہی ایسی ہے۔" اس دن مجھے
جی پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی ان کے لئے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس میں
، نے بے بے سے نہ کہنے ہی کا وعدہ کر کے ان کے لئے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ
ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤ جی کے
ں دودھ، پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں۔ مگر اس رسد سے داؤ جی کو کبھی بھی کچھ
سبب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی۔ اس نے کسی حد تک
سے رعایتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک صبح میں دودھ سے بھرا تا ملوٹ ان کے یہاں لے کر آیا تھا
ربے بے گھر پر نہ تھی۔ وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساون کے جوہر میں اشنان کرنے گئی
ں۔ اور گھر میں صرف داؤ جی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤ جی نے کہا "چلو
ج تینوں چائے پئیں گے۔ میں دوکان سے گڑ لے کر آتا ہوں۔ تم پانی چولھے پر رکھو۔"
، بی نے جلدی جلدی چولھا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا۔ اور پھر ہم دونوں
یں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤ جی گڑ لے کر آگئے تو انھوں نے کہا "تم
دنوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بناتا ہوں۔" چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی۔
رمیں ڈائرکٹ اور اِن ڈائرکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤ جی چولھا بھی جھونکتے
تے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اونچے اونچے بتاتے جاتے تھے۔ گلیلیو نے
ہا۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔" گلیلو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد
ھومتی ہے۔ یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی۔ پانی ابل رہا تھا۔ داؤ جی خوش

ہو رہے تھے۔ اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا گیت گا رہے تھے
"او گگولو او گگولو! گلیلو کی بات مت بھولنا۔ گلیلو کی بات مت بھولنا۔ انھوں نے
چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولھے پر ہی تھا۔ ا
داؤ جی نے ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گُڑ بُڑ گُڑ بُڑ کے ساتھ گگولو گلیلو گ
گلیلو کئے جا رہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ بی بی مسکرا رہی
اور مشین چلائے جاتی تھیں۔ اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش
تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبے کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں وا
پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر دا
ہوئی۔ داؤ جی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو
چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے مو
چھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھ
موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولھے کی طرف دیکھا۔ اور داؤ جی نے چ
سے اُٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ "چائے ہے!"

بے بے نے ایک دو ہتڑ داؤ جی کی کمر میں مارا اور کہا۔ "بڈھے بردھا تجھے لا
نہیں آئی۔ بچہ پر بُہار پھرے تجھے یم سمیٹے یہ تیرے نہائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ
میں نہ کتی تو بچے سب کا ڈر نہ تھا۔ تیرے بھا نویں میں کل کی مرتی آج مروں۔ تیرا سو
ہلکہ۔ تیری آسیں پوری ہوں۔ کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی ریکھا نے میر
پلے باندھ دیا۔۔۔۔ تجھے موت نہیں آتی۔۔۔۔ اوں ہوں تجھے کیوں آئے گی
اس فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی کپڑے سے پتی
پکڑ کر چولھے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داؤ جی
کی پنڈلیوں، در پاؤں پر گرے اور وہ۔" اوہ تیرا بھلا ہو جائے! اوہ تیرا بھلا ہو

وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔ ان کے اس فرار بلکہ راز فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے۔ اور ہماری ہنسی کی آواز ایک لمحہ کے لئے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی "میری سوت بتا بڈھے سے تیرا کیا ناطہ ہے؛ بتا نہیں تو ابھی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی"؟

بی بی بچاری پھس پھس رونے لگی تو میں بھی اُٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک گیا۔ داؤ جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے۔ اور اپنے پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں نہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے۔

"شکر کردگار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ کہ معصیتے"!

تھوڑی دیر رک کر پھر کہا "میں اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں۔ جس کے سر مطہر پہ کتے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی"۔

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ و شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی وہ اپنے محبوب کی طفیل نار جہنم سے بچ لئے۔ خدائے ابراہیمؑ مجھے جرأت عطا کرے، مولائے ایوبؑ مجھے صبر کی نعمت دے۔"

میں نے کہا "داؤ جی آقائے نامدار کون"؟

تو داؤ جی کو سن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انھوں نے شفقت سے کہا "جان پدر یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر۔ وہ میرے آقا بھی تھے۔ میرے باپ بھی۔ اور میرے استاد بھی۔ وہ تیرے دادا استاد ہیں۔ دادا استاد ......" اور انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔

آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہئ قسمت' مجزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤجی سے سُنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انھوں نے کتنی ہی دیر لگادی۔ کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے۔ اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔" داؤجی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے لگتے تھے۔ اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

داؤجی نے مسکرا کر کہا۔" جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام جی ہیں۔ وہ مسیحا نہ ہو آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر آہستہ آہستہ بستر میں پہنچ گیا۔ اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤجی کی طرف دیکھنے لگا۔ جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفے کے بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے ____ کہنے لگے" میں کیا تھا اور کیا ہو گیا ____ حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سر مبارک اٹھا کر فرمایا' چوپال زادے ہمارے پاس آؤ۔ میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ چیتہ، ہٹھار اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنا کر بیٹھے ان کے سامنے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا۔ اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی ____ میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا۔" بھئی ہم تم کو روز یہاں پر بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انھیں چرنے چگنے کے لئے ہمارے پاس آجایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو۔ پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا۔" کیا نام ہے تمھارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا۔ چنتو ____ حضرت مسکرائے ____ تھوڑا سا ہنسے بھی ____ فرمانے لگے

را نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے" چنت رام ہو گا ـــــ میں نے سر ہلا دیا ـــــ
ضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے
گلے میں کھدر کا لمبا کُرتا تھا۔ پاجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں
دھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سُرخ رنگ کا جانگیہ لپٹا ہوا تھا۔
یں نے بات کاٹ کر پوچھا" آپ بکریاں چراتے تھے داؤ جی؟"
"ہاں ہاں" وہ فخر سے بولے" میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں"
حیرانی سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔ اور میں نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے
جلدی سے پوچھا" اور آپ اسکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے" داؤ جی نے
کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی۔ اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے" جانِ پدر
اس زمانے میں تو شہروں میں بھی اسکول نہ ہوتے تھے۔ میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔
آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی ہائی اسکول کا نام بھی جانتا تھا؟
وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ ارد گرد کے لوگ اپنے لڑکے کو چار حرف
پڑھنے کو ان کے پاس بھیج دیتے ـــــ ان کا سارا خاندان زیورِ تعلیم سے آراستہ
اور دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والدان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم
اور چوٹی کے مبلّغ تھے۔ جدّ امجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے۔
فارسی۔ عربی۔ جبر و مقابلہ۔ اقلیدس۔ حکمت اور علم ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں
تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی زبانی ان کے
تبحّرِ علمی کی سب داستانیں سنیں۔ شیفتہ اور حکیم مومن خاں مومن سے ان کے بڑے
مراسم تھے۔ اور خود مولانا کی تعلیم دلّی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی۔۔۔
مجھے داؤ جی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لئے میں نے جلدی سے
پوچھا" پھر آپ نے حضرتِ مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا۔

"ہاں زاوجی" اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتیں ہی ایسی تھیں، ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں جس کی طرف توجہ فرماتے تھے بندے سے مولا کر دیتے تھے۔ مٹی کے ذرے کو اکسیر کی خاصیت دیتے تھے۔ میں تو اپنی لاٹھی زمین پر ڈال کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا: "اپنے بھائیوں کے پاس بوریئے پر بیٹھو۔ میں نے کہا "جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گزر گئے۔ اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے۔ اپنے چوبی صندوقچے سے حروف ابجد کا ایک ٹکڑا نکالا اور بولے "الف، بے، پے، تے ——
سبحان اللہ کیا آواز تھی۔ کس شفقت سے بولے تھے۔ کس لہجے سے فرما رہے تھے الف، بے، پے، تے"۔ اور داؤ جی ان حرفوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا "ادھر رہٹ تھا۔ اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض" پھر انھوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا۔ "اور اس طرف مزارعین کے کوٹھے، دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا۔ اور سامنے ان کی عظیم الشان حویلی۔ اس باغیچے میں ان کا مکتب تھا۔ درِ فیض کھلا تھا۔ جس کا جی چاہے آئے۔ نہ مذہب کی قید نہ ملک کی پابندی......

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد باادب باملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا "حضرت مولانا کا اسم گرامی شریف کیا تھا؟" تو پہلے انھوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے "حضرت اسماعیل چشتی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انھیں جانِ جاناں کہہ کر پکارتے تھے۔ کبھی جانِ جاناں کی رعایت سے مظہر جانِ جاناں بھی کہہ دیتے تھے"۔

میں ایسی دل چسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہش مند تھا کہ داؤ جی اچانک رک گئے اور بولے "سب سیڈی ایری سسٹم کیا تھا؟" ان انگریزوں کا

بُرا ہوا یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سولئے کے پہاڑے کی طرح میں نے سب سیڈی ایری سسٹم کا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انھوں نے پیزیسے گرامر اٹھائی اور حوالے۔" باہر جاکر دیکھ کے آکہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا یا نہیں"۔ میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا۔

دادا جی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے تو وہ پکار کر کہتے ——
"سب ایک ایک شعر سناؤ"۔ پہلے مجھ ہی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا ؎

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے "اولین شعر نہ سنوں گا، اردو کا کم سنوں گا۔ اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا"۔ میں کہتا مجھے سوچنے دیجئے۔ اتنے میں بی بی سناتی۔ بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔ ؎

شنیدم کہ شاپوردم درکشید
چو خسرو براسمش قلم درکشید

اس پر دادا جی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔ بی بی قینچی رکھ کر کہتی ؎

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

دادا جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے کہ بٹیا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے"۔

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے: "بھئی آج تمھاری بے بے بھی ایک سنائے گی"
مگر بے بے ایک روکھا سا جواب دیتی "مجھے نہیں آتے شیر کبت"
اس پر دادا جی کہتے: "گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی۔ اور دادا جی عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے: "میں اپنے اس گوگو مولو کی شادی پر سرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا۔ اور نکاح نامے میں شہادت کے دستخط کروں گا۔ میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا۔ تو وہ کہتے: "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہوگی۔ ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہوگی۔ اس بدھو کو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادریاں گھوڑیاں ہوتی ہیں یا مرغی۔ وہ تو فر فر سب کچھ سناتی ہوگی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا۔ پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا۔ پھر خط شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خط شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہو کو سکھا دوں گا ______ سن گوگو! پھر میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ اور وہ بات بات پر بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منھ دیکھا کرے گا۔" پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے۔ خیلے خوب خیلے خوب کہتے۔ جانِ پدر چرا ایں قدر زحمت می کشی .... خوب....... یاد دارم .... اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچارے دادا جی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کئے جاتے ______ ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے: "جس طرح

خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے، ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے۔

اس کے خیالات مجھے کچھ اچھے نہیں لگتے۔ یہ سوانگ، یہ مسلم لیگ، یہ پلچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلاتا، گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا۔ ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اسے راہِ راست پر لے آئے گی۔

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لئے ہوا تھا کہ اگر میں نے منھ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلے گی جس سے داؤ جی کو بڑا دکھ ہو گا ـــــــ میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آ گئی۔ جیجا جی رام پرتاب کے بارے میں داؤ جی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے۔ کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انھوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤ جی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ بے بے زار و قطار رو رہی تھی۔ امی چند آنسو بہا رہا ہے اور محلے کی عورتیں کھسر پھسر کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤ جی میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں۔ آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔ جیجا جی کے باپ بولے "منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا۔ عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤ جی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے انھوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا "یہ کیا ہوا بیٹا اٹھو! یہ تو تمھاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے۔ اسے یوں منحوس

نہ بناؤ۔ بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤجی سے لپٹ گئی۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قرۃ العین میں تیرا گنہ گار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کردے گی اور شاید برخوردار رام پرتاب بھی۔ لیکن میں اپنے کو معاف نہ کرسکوں گا۔ میں خطاکار ہوں اور میرا سر خجل تیرے سامنے خم ہے۔" یہ سُن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی۔ اور داؤجی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا "منشی جی آپ فکر نہ کریں۔ میں بیٹی کو کریا پڑھا دوں گا۔" داؤجی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کریا تو یہ پڑھ چکی ہے، گلستان اور بوستاں بھی ختم کرا چکا ہوں، لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی۔" اس پر وہ ہنس کر بولے "ساری گلستاں تو میں نے بھی نہیں پڑھی، جہاں عربی آتی تھی آگے گزر جاتا تھا" ——— داؤجی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے، بی بی نے گوڑ لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چل دی۔ داؤجی میرا سہارا لے کر چلے تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا "لو یہ بھی لا رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گولو.... او مردم دیدہ .... تجھے کیا ہو گیا...... جان پدر تو کیوں ......!"

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور راکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤجی پیدل چل رہے تھے اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو داؤجی آگے بڑھ کر رتھ کا پردا اٹھاتے اور کہتے "لاحول پڑھو بیٹا لاحول پڑھو!"

ور خود آنکھوں پر رکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

رانو ہمارے محلّہ کا بڑا ہی کثیف انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے اسی کا تھا۔ س میں بلیس تیس بکریاں اور گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام رانو گلی کے بغلی یدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا تھا۔ تقریباً سارے محلّے والے اسی سے دودھ لیتے تھے۔ ور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یوں ہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر دادا جی کو "پنڈتا جے رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ دادا جی نے اسے کئی مرتبہ کہہ کر سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں۔ کیوں کہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا۔ لیکن رانو نہیں مانتا تھا۔ وہ اپنی مونچھ کو چبا کر کہتا: "ارے بھئی۔ جن کے سر پر بودی (چٹیا) ہو وہی پنڈت ہوتا ہے" ——— چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے باڑے میں جوا بھی ہوتا تھا۔ اور گندی ور فحش بولیوں کا مشاعرہ۔ بی بی کے جانے کے ایک دن بعد جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا: "موری تو چلی گئی بابو اب تو اس گھر میں رہ کر کیا لے گا۔" میں چپ رہا۔ تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈبہ پھیرتے ہوئے کہا: "گھر میں گنگا بہتی تھی سچ بتا کہ غوطہ لگایا کہ نہیں۔" مجھے اس بات پر غصہ آیا اور میں نے تا ملوٹ گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ چکرا کر تخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ دادا جی کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا۔ اور ابا جی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حولدار صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت متنبہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سے رانو دادا جی پر آتے جاتے

طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چپٹی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے۔ اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی۔ گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اتارنے کی جسارت نہیں کی۔ لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال سنگھ میموریل ہائی اسکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے۔ اور ہم سا خوش قسمت استاد بھی خال ہی خال ہو گا۔ جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو۔ میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا "حضور، آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے، ہنس کر فرمانے لگے "چینت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو۔ بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے کہا "اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لیے دوائی نکال لاؤں، اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لیے نذر کروں لیکن میرا بس نہیں چلتا ـــ خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے۔ خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے" ـــ داؤجی گذرے ایام کی تہہ میں اترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

" بس صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا "خادم آ گیا" مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا۔ ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور

پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا، وہ دعا دیتے، میرے والدین کی خیریت پوچھتے۔ گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "لو بھئی جینت رام ان گناہوں کی گٹھری کو اٹھالو"۔ میں سبدِ گل کی طرح انھیں اٹھاتا اور پھر کمر پر لاد کر حویلی سے باہر آجاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو، کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو۔ اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے۔ جینت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا۔ مگر نہیں مانے یہی فرماتے رہے کبھی جی چاہتا ہے تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں وضو کرنے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اتارتا اور انھیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انھیں اس طرح جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد جرأت نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا۔ اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبہ کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا۔ تو فرماتے۔ ہم جانتے ہیں جینت رام! تم ہماری خوشنودی کے لئے قصبہ کی سیر کراتے ہو۔ لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھرتا ہوں دوسرے تمھارا وقت ضائع کرتا ہوں اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔ اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہُما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لئے وقف کر دیا ہے۔ جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انھیں سنایا اس قدر خوش ہو گئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دستِ شفقت میرے سر پر پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر مجھے انعام دیا۔ میں نے اسے حجرِ اسود جان کر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر

سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ جو کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے۔ خدا نے تجھے سعادت نصیب کی۔ جنت رام تیرا موسیٰ چوپاں کا پیشہ ہے۔ تو شاہ بطحا کا پیرو ہے اس لئے خدائے عزوجل تجھے برکت دیتا ہے۔ وہ تجھے اور بھی برکت دے گا۔ تجھے اور کشائش میسر آئے گی۔

داؤ جی یہ باتیں کرتے کرتے گھٹنوں پر سر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا اور داؤ جی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے کے لئے اٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے۔ اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت اسکول پہنچنے کا انھوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں اسکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ کی راہ کھسک گیا تو انھوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آ کر پیٹنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بدزبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤ جی کے بچے گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ اور کبھی کبھی ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انھیں کتے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اس قدر کہتے "دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جانِ پدر یہ تیرے بڈھے باپ کو کتا کہتا تھا" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انھیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انھیں غصہ آتا تھا نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انھوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب برخوردار آفتاب کہہ کر انھیں یاد کرتے تھے۔ لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے جن میں گو لو انھیں بہت مرغوب تھا۔ طنبورا دوسرے درجہ پر مستڑ ہونق اور اخفش اسکوائرڈ ان سب کے بعد

آتے تھے۔ اور ڈومنی صرف غصے کی حالت میں کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی ابجد کو ضرب دے دے کر تنگ آچکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے ڈھکیل کر اونچے اونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیئوں وسنا۔

داؤجی حیرانی سے میری طرف دیکھتے۔ تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیئوں نیئوں نیئوں دسنا تے۔ دکھ تینوں نیئوں دسنا ــــــ دسنا دسنا دسنا دسنا ۔۔۔۔۔۔ تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گاما رونا رونا رونا۔ سارے گاما رونا رونا ــــــ تے دکھ تینوں نیئوں دسنا۔ وہ عینک کے اوپر سے مسکراتے میرے پاس آکر کاپی اٹھاتے۔ صفحہ نکالتے اور میری کتابوں کے درمیان تھوڑا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے تھے۔

"سن بیٹا" وہ بڑی محبت سے کہتے "یہ کوئی مشکل سوال ہے!" جب ہی وہ سوال سمجھانے کے لئے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا۔ "دیکھ پتر میں تیرا داؤ نہیں ہوں؟" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"نہیں!" میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

"تو اور کون ہے؟" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"وہ سچی سرکار" میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا "وہ سچی سرکار، وہ سب کا پالنے والا ــــــ بول بکرے سب کا داتا کون؟"

وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا۔

"داؤجی خفا ہو گئے کیا؟"

وہ مسکرانے لگتے۔ "چھوڑ طنبورے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا ــــ

مجھے پانی تو پی آنے دے۔"

میں جھوٹ موٹ برا مان کر کہتا۔" لو جی جب مجھے سوال سمجھنا ہوا دادا جی کو پانی یاد آ گیا۔"

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے۔" اخفش اسکوائر جب تجھے چار ایکس کا مربع نظر آرہا تھا تو تو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا۔ اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو۔"

...... اور اس کے بعد پتہ نہیں دادا جی کتنے دن باقی نہ بچتے۔

فروری کے دوسرے ہفتے کی بات ہے۔ امتحان کا کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا۔ اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی۔ اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ دادا جی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انھوں نے کہا۔ کل باون پراپوزیشن ہیں زبانی یاد کر لے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انھیں رٹنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا صبح کو بھول جاتا۔ میں دل برداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات دادا جی مجھ سے جومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں سن کر اٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکا تھا اور انھیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے بیٹھتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے دادا جی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا اور میں باہر صحن میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ کر بیچ بیچ رونے لگتا۔ گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا۔ اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ تو میں نے دادا جی کی عزت بچانے کے لئے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے

نکل جاؤں۔ اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لئے سر اوپر اٹھایا تو داؤجی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انھوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤجی نے میرا سر چوم کر کہا "لے بھئی طبنو سے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔" پھر انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا۔ اور بیٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انھوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کرکے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انھوں نے کہا "اقلیدس چیز ہی ایسی ہے تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے۔ میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انھیں میں اچھی طرح پڑھ کر اپنی کاپیوں پر ہمیں اتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات اُلجھ گئی۔ میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رو سے اس کا جواب ٹھیک آتا تھا۔ لیکن علم ہندسہ سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا۔ لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے دست مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا۔ لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے "جینت رام اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لئے حکم ربانی سے کم نہیں۔ اس لئے خاموش ہوں۔ بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی مجال! لیکن حضور مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ فرمانے لگے "تم

بید جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سُن لی ہوتی۔ میں نے سر جھکا کر کہا۔" ارشاد!" فرمایا "دلّی میں حکیم ناصر علی سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں۔ اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا۔ اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا ——— والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی پتائی کر رہا ہوں جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا۔

چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گزرے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے نہ اجازت مل سکتی تھی نہ رقعہ۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے۔ اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ——— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں بہت ہی پریشان تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کل پونجی دو روپے چرائے اور نصف اس کے لئے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور اب تک میرا سر ان دونوں کرم فرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ——— گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کی مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا بدقسمت ہوں، اور بے اجازت جا رہا ہوں۔ لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور گٹھڑی کندھے پر رکھ کر میں وہاں سے چل دیا ——— سُن رہا ہے؟"

داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔
رضائی کے بیچ خار پشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا۔ جی"۔
داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا" قدرت نے میری کمال مدد کی۔ ان دنوں جاکھل جیند برستہ حصار والی ریل کی پٹری بن رہی تھی یہی سیدھا راستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن مزدوری کرتا اور دو دن چلتا، اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں دلی پہنچ گیا۔ منزل مقصود تو ہاتھ آگئی تھی، لیکن گوہر مقصود کا سراغ نہ ملتا تھا۔ جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سیستانی کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت کی یاوری تھی۔ صحت اچھی تھی، انگریزوں کے لئے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کمبل پھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جوئندہ یابندہ! آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہوئی۔ وہ پتھر پھوڑوں کے محلے کی ایک تیرہ و تاریک گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ایک چھوٹی سی کوٹھری میں فروکش تھے اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا" کون ہے"؟ میں نے سلام کر کے کہا" حکیم صاحب سے ملنا ہے"۔ حکیم صاحب دوستوں کے حلقے میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے۔ "اسم گرامی"؟ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا" پنجاب سے آیا ہوں" اور ...... میں پوری بات بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے" او ہو! چنت رام ہو"؟ میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ فرمانے لگے" مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے۔ شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا۔ میں اسی طرح کھڑا رہا ــــ تو پاٹ دار آواز میں بولے۔ میاں اندر آجاؤ۔ کیا جیب کا روزہ رکھا ہے"؟ میں ڈر

آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا۔ اور ویسے ہی عروسِ نو کی طرح بیٹھے رہے۔ پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا "برخوردار بیٹھ جاؤ۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ تو اپنے دوستوں سے فرمایا، بھئی ذرا ٹھہرو۔ مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا کہ بتاؤ ہندسہ کا کون سا مسئلہ تمھاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انھوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کرتہ یوں اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہوگئی۔ پھر فرمایا "بناؤ اپنی انگلی سے میری کمر پہ ایک متساوی الساقین۔ مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحے کے بعد بولے "میاں جلدی کرو۔ نابینا ہوں۔ کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا، اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتی ہوئی انگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے۔ اب اس نقطہ س سے خط ب ج پر عمود گراؤ۔ ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا۔ دوسرے وہاں کچھ نہ آتا تھا۔ یوں ہی اٹکل سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا۔ تو تیزی سے بولے "ہے ہے کیا کرتے ہو۔ یہ نقطہ س ہے کیا؟" پھر خود ہی بولے "آہستہ آہستہ عادی ہوجاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نیچے نقطہ س ہے وہاں خط کھینچو ———

اللہ اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا۔ کیا آواز تھی۔ اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی۔" پھر داؤ جی دلّی کے دنوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا "پھر کیا ہوا داؤ جی"؟ انھوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "رات بہت گذر چکی ہے، اب تو سو جا پھر بتاؤں گا۔" میں ضدی بچّے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا۔ تو انھوں نے کہا "پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہوگا۔

ن چھوٹی چھوٹی پراپوزیشن کو بتاشے سمجھے گا۔" میں نے جواب دیا۔" حلوا سمجھوں گا۔
فکر نہ کریں"۔ انھوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔" بس مختصر یہ کہ میں ایک
حکیم صاحب کی حضوری میں رہا۔ اور اس بحر علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور
ہوں کو دھویا۔ واپسی پر میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا۔ اور ان کے قدموں
ر رکھ دیا۔ فرمانے لگے چتنت رام اگر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ لیں۔
پر میں رو دیا۔ تو دست مبارک محبت سے میرے سر پہ پھیر کر کہنے لگے۔ ہم تم سے
مت نہیں ہیں۔ لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جاؤ تو ہمیں
ساتھ لے جانا۔ یہ کہتے ہوئے داؤجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ مجھے اسی طرح
تم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤجی
میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے تھن متھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے۔" اسپ تازی
طویلہ خر نہ بن۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گزرتا۔ اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند
ر دیتا۔ میرے مسلسل مون برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد
پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انھوں نے مجھے آ جگایا۔ اور میری منتوں
شامدوں۔ گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا، کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔
وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل
میں نہ آدم نہ آدم زاد۔ تاریکی سے کچھ بھی نہ دکھائی دیتا تھا اور داؤجی مجھے اسی
سیر کو لئے جا رہے تھے، میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔ ابھی گراں خوابی
ر نہیں ہوئی۔ ابھی طنبورا بڑبڑا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے، کوئی
نکال طنبورے کسی آہنگ پر نہ بج یہ کیا کر رہا ہے! جب ہم بستی سے دور نکل گئے۔
ر صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤجی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔

سنرداروں کا رہٹ آیا۔ اور نکل گیا۔ ندی آئی اور نیچے نکل گئی۔ قبرستان گزر گیا۔ مگر
داؤجی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے چلے جارہے تھے۔ جب تھبہ پر پہنچے تو میری روح
فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گزرتے تھے۔ کیونکہ پرانے زمانے میں
یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اسی ٹیلے پر رہتی تھیں اور آنے
جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤجی نے میرے
گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا۔

سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ۔ پھر
لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑ دو۔ تب میرے پاس آؤ۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں کا...
سے جان بچانے کے لئے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے
ڈھیلے پر آرام لیا۔ اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہوگا۔ اس
کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا۔ اور جب دس لیے
چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک
درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے۔ دوسرے میری پسلی میں بلا کا
درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ تھبہ پر جا کر داؤجی کو سوئے ہوئے اٹھاؤں
اور گھر لے جا کر خوب تماشا کروں۔ غصے سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے
پاس پہنچا۔ داؤجی تھبہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر
رہے تھے۔ اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے۔ ؎

جہنا کم کُن کہ فردا روزِ محشر
بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشتِ شہادت
فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو۔ اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ

دح دوا میں تمھیں ...... میں تمھیں بتارہا ہوں ...... سنا رہا ہوں.....
یلک دھمکی دیتے جاتے تھے اور پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفاکم کن جفاکم کن
تے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت اور جامد کھڑا رہا۔ اور پھر زور سے چیخ
رکر بجائے قصبے کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤ جی ضرور اسم اعظم
نتے تھے۔ اور جن کو قابو میں کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے
کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ با تصویر والا جن تھا۔ جب داؤ جی کا طلسم اس پر
چل سکا تو اس نے انھیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے۔ جفاکم کن جفاکم کن
ر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا —— تھوڑی دیر
بعد داؤ جی آئے۔ انھوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا "چل طنبورے"۔ اور میں ڈرتا
ڈرتا ان کے پیچھے ہولیا۔ راستے میں انھوں نے گلے میں لٹکی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں
کونے ہاتھ میں پکڑ لیے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لے لے ڈال خریدا آڑیا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے چلتے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے
دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا۔ اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں۔ اور اس کا
سارا وجود جناتی بھاری ہو گیا —— اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا
دیتا میں ان کے ساتھ سیر کو ہرگز نہ جاتا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے
ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ کر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پڑوس
الی کتیا کی طرح داؤ جی سے چمٹ گئی۔ سچ مچ ان سے لپٹ گئی اور انھیں دھکا دے کر
زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی۔ "بڈھے ٹوٹکی یہ سب تیرے منتر ہیں"۔ "یہ سب تیری فارسی
ہے۔ تیرا کالا علم ہے۔ تو اُلٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں

پھینکتے ہیں، اجاڑ مانگتے ہیں، موت چاہتے ہیں۔" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ میں مرگئی میں جل گئی۔ لوگو اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا بندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے۔ میرا انگ انگ توڑ دیا ہے۔" امی چند تو داؤ جی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا۔ اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے۔ لیکن جنوں کی خشت باری انھیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤ جی نے زندگی میں پہلی بار مجھے جھڑک کر کہا۔ "تو احمق ہے اور تیری بے بے ام الجاہلین ـــــ میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا۔ لے دے کر تو شعور کے بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس ـــــ صد افسوس"۔ بے بے کو اسی طرح چلاتے اور داؤ جی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا ـــــ اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آرہا تھا تو راستے میں راکو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا "سنا بابو تیرے کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمھارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں"۔

میں نے اس کمینے کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی پراپوزیشن سنتے ہوئے پوچھنے لگے "بیٹا کیا تم سچ مچ جن بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے۔ "واقعی تو بہت بھولا ہے اور میں نے خواہ مخواہ جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں۔ ہم نے جو دلی اور پچھتے مزدور کو بلا کر برساتی بنوائی ہے۔ وہ تو رے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے کا کام ہی کرتے ہیں یا کہ چنائی بھی کر لیتے ہیں؟" میں نے جل کر کہا "جتنے مذاق چا

لو مگر جس دن سر پھٹے گا اُس دن پتہ چلے گا داؤ۔"

داؤ جی نے کہا" تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں
ٹ سکتا اس لئے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے۔ اور نہ میرے تیرے
زی بے بنے کے سر میں لگے گی۔

پھر بولے" سن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی
دنے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی ———— سمجھ گیا۔؟"

" سمجھ گیا" میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبے میں ہائی اسکول ضرور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر ضلع تھا
ان دینے کے لئے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آگئی جب ہماری جماعت
ن دینے کے لئے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا
جمع تھا اور اس ہجوم سے داؤ جی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے
الے انھیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ اور داؤ جی سارے سال کی
ائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ
ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر موسم کے تغیر و تبدل پر
جاتے۔ وہاں سے پلٹتے تو" اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے
معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا۔ ایک صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے
تی۔ اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی" کہہ کر پوچھتے یہ کون تھا۔

" جہانگیر" میں نے جواب دیا اور وہ عورت " نور جہاں"۔ ہم دونوں ایک ساتھ
صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟"

میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے۔ مثالیں؟ میں نے مثالیں
سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے۔ اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل

ہوا تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آگئے۔ اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بریک ان ٹو
فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا۔ اور موٹر اسٹارٹ ہو چلی۔
اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے۔ طبنورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی......
مادیہ گھوڑی...... ماکیاں...... مرغی ـــــ ایک سال بعد خدا خدا کر کے
یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا۔

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے
بڑھ کر۔ تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اتوار کی صبح
داؤجی کا کوئی بیس صفحہ لمبا خط ملا۔ جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب
قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہیں تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے
تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں
نہ پڑتا تھا۔ اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جوں ہی میں نے
پاؤں باہر رکھا داؤجی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔
چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا۔ اور اسی نمبر اسی نمبر کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ انھوں نے
میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا "کون سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوٹ
کہا "چاردیواری والا۔" جھلا کر بولے "تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہ
ہوں گے"۔ میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیر کی طرف جھلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں
ہاں جی ـــــ گولی مارو کھڑکیوں کو۔" داؤجی ڈولی ہوئی آواز میں بولے۔"
مجھے برباد کر دیا طبنورے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا
کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا۔ مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ تو نے میری بات نہ
بیس نمبر ضائع کیے...... پورے بیس نمبر۔"

اور داؤجی کا چہرہ دیکھ کر میری اسّی فی صدی کامیابی بیس فی صدی ناکامی
نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے
رہے:" اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو دو ایک نمبر ضرور دے دے گا۔ تیرا باقی حل
ٹھیک ہے اس پرچے کے بعد داؤجی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے۔
رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی۔
اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے ہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آجاتے
رکمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤجی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان
نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔
ن دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤجی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ
س بات پر مُصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹے ان کے ساتھ گزارہ کروں۔
کہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لئے تیار کر دیں۔ لیکن میں ان کے پھندے میں
نے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا۔ اور ہے لیکن داؤجی سے پڑھنا
ظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا
نہوں نے کہا۔ اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا۔ فرمایا اس کی
رکیب نحوی کرو۔ جولداروں کی گائے اندر گھس آئی۔ میں اسے لکڑی سے باہر
نکال رہا ہوں اور داؤجی پوچھ رہے ہیں۔ cow ناؤن ہے یا ورب۔ اب
عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے۔ مگر داؤجی
صار ہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی۔ TO COW کا مطلب ہے ڈرانا،
دھمکی دینا۔ اور یہ اُن دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا
انتظار کر رہا تھا —— پھر ایک وہ دن بھی آیا جب ہم چند دوست شکار

کھیلنے کے لئے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی کے آگے سے نہ جائیں
وہاں داؤجی ہوں گے' اور مجھے روک کر شکار۔ بندوق اور کارتوسوں کے محاورے
پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دیتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر
ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے۔ افسو
آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے۔ میں شرارتاً چیلے خوب کھیلے خوب
کہہ کر ہنستا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور ابا جی لڈوؤں کی چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھ
داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر میں بیٹھے تھے۔ ابا جی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کر
اٹھالائے۔ اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سا
شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے۔ میرا خیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈ
آ جائے لیکن نہ آسکی۔ بنیاد کمزور تھی"۔

"ایک ہی تو نمبر کم ہے"۔ میں نے چمک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا د
دیکھ ہو گیا ہے"۔ "خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں"۔

پھر ابا جی اور باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ بکریں لڑانے میں مش
ہو گیا۔

اوّل اوّل کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ ا
بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ چھٹیوں ؟
جب گھر آتا تو جیسے اسکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤجی کو بھی سلا
کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ پتلون اور ٹائی وغیرہ دیکھ
بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے۔ اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی

یں کرسی کھینچ کران کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ
تا انھیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے
ا کر کتابیں دیکھ جاتے۔ امی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بینک میں ملازم ہو گیا تھا۔
لی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤ جی منصفی جاتے تھے۔
۔ کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی ——

کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤ جی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو
پہلے ہمارے ساتھ آپوٹا پو کھیلا کرتی تھیں بنتِ عم بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی
آپوٹا پو میں گزارنے کی کوشش کرتا۔ اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر
فت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا۔

ان ہی ایام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوب صورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں
یک پیکٹ خریدا تھا اور ان پر نہ آپا جی کو خط لکھے جا سکتے تھے نہ ہی داؤ جی کو۔ نہ دسہرے
چھٹیوں میں داؤ جی سے ملاقات ہو سکی۔ نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی ایسٹر
رہ گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے ...... ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے
ئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں۔ اور
ں نے ہم سب کو گھر بلوایا۔ ہمارے لئے ایک جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنئے۔ ساہوکار گھر بار
ڑ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد
جرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی ہے۔
دن ہمارے قصبے میں بھی چند گھروں میں آگ لگ گئی اور دو ناکوں پر سخت لڑائی
ئی۔ تھانے والے اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا۔ اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب
وسکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤ جی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس
ن پہچانی گلی میں عجیب و غریب صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤ جی کے گھر کی

ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا۔ اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔
گھر آکر بتایا کہ داؤجی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اور یہ کہتے ہوئے
گلا رندھ گیا اور اس دن مجھے یوں لگا جیسے داؤجی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے
اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے بے وفا تھے ——!
کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے بیائ
کے نام نوٹ کر کے کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گزرا تو کھلے میدان میں
آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے۔ ا
گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش
مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا
"ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گ
"کون سے گھر میں"؟ بزرگ نے پوچھا۔
"رہتکی مہاجروں کے گھر میں"! لڑکے نے کہا۔
"پھر کیا انھوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا"۔
اتنے میں بھیڑ میں سے کسی نے چلا کر کہا "اوے رانو جلدی آ اوے جل
آ —— تیری سامی —— پنڈت —— تیری سامی"!
رانو کیکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انھیں روک کر اور ایک
لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک د
سا لگا۔ جیسے انھوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قر
لوگوں سے کہا۔
"یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے —— اسے کچھ مت کہو......
یہ تو...... یہ تو" خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا۔ اور ا

نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

" بتاؤں تجھے بھی ——— آ گیا بڑا حمائتی بن کر ——— تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا " انصار ہوگا شاید"

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤ جی کو گھیرے کھڑے تھے۔ اور رانو داؤ جی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور کہہ رہا تھا " اب بول بیٹا اب بول" اور داؤ جی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے پگڑی اتار کر کہا " پہلے بودی کا تو بودی" اور رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤ جی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا " بلا دیں گے جی؟" اور رانو نے کہا " جانے دو بڈھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا" پھر اس نے داؤ جی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا " کلمہ پڑھ پنڈتا" اور داؤ جی آہستہ سے بولے۔

" کون سا؟"

رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا " سب کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں"

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ " چل بکریاں تیری انتظار کرتی ہیں۔"

اور ننگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فرید اچھل رہا ہو!۔

○

انتظار حسین

آخری آدمی

الیاسف اس قریئے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں۔ اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔

اور اس قریئے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے اور پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغ خراب کرتے تھے نایاب ہو گئے۔ پر اس شخص نے جو انھیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا یہ کہا کہ بندر تو تمھارے درمیان موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے۔ اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا۔ اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی مجرم الیعذر کی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس الٹے پاؤں آئی۔ پھر الیعذر کی جورو خواب گا

تک گئی اور حیران و پریشان واپس آئی۔ پھر یہ خبر دور دور پھیل گئی اور دور دور سے لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے۔ کہ الیعذر کی خواب گاہ میں الیعذر کی بجائے ایک بڑا بندر آرام کرتا تھا۔ اور الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی۔ کہ اے عزیز الیعذر بندر بن گیا ہے۔ اس پر دوسرا زور سے ہنسا۔ "تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا"۔ اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ منہ اس کا سرخ پڑ گیا۔ اور دانت نکل آئے۔ اور چہرے کے خدوخال کھنچتے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا کمال حیران ہوا۔ منہ اس کا کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اور پھر وہ بھی بندر بن گیا۔

اور الیاب ابن زبلون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تجھے کیا ہوا ہے کہ تیرا چہرہ بگڑ گیا ہے۔ ابن زبلون نے اس بات کا برا مانا اور غصے سے دانت کچکچانے لگا۔ تب الیاب مزید ڈرا اور چلا کر بولا۔ کہ اے زبلون کے بیٹے! تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، ضرور تجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اس پر ابن زبلون کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور دانت بھینچ کر الیاب پر جھپٹا۔ تب الیاب پر خوف سے لرزہ طاری ہوا اور ابن زبلون کا چہرہ غصے سے اور الیاب کا چہرہ خوف سے بگڑتا چلا گیا۔ ابن زبلون غصے سے آپ سے باہر ہوا۔ اور الیاب خوف سے اپنے آپ میں سکڑتا گیا اور وہ دونوں کا ایک مجسم غصہ اور ایک خوف کی پوٹ تھے آپس میں گتھ گئے۔ ان کے چہرے بگڑتے چلے گئے۔ پھر ان کے اعضا بگڑے۔ پھر ان کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں مدغم ہوتے چلے گئے۔ اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے۔ پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ چیخیں بن گئیں۔ اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے کہ ان سب میں عقل مند تھا۔ اور سب سے آخر تک آدمی بنا رہا۔

تشویش سے کہا کہ اے لوگو! مقرر ہمیں کچھ ہو گیا ہے۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا۔ اور حلقہ زن ہو کے دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا۔ اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگو! وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لئے خرابی ہے۔ لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انھیں آلیا۔ دہشت سے صورتیں ان کی چپٹی ہونے لگیں۔ اور خدوخال مسخ ہوتے چلے گئے۔ اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور سکتہ ہو گیا۔ اُس کے پیچھے چلنے والے بندر بن گئے تھے۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ جاننا چاہئے کہ وہ بستی ایک بستی تھی۔ سمندر کے کنارے اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی، بازاروں میں کھوئے سے کھوا چھلتا تھا۔ کٹورا بجتا تھا۔ پر دم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں۔ اور اونچے برجوں میں عالی شان چھتوں پر بندر ہی بندر نظر آنے لگے۔ اور الیاسف نے ہراس سے چاروں سمت نظر دوڑائی اور سوچا کہ میں اکیلا آدمی ہوں اور اس خیال سے وہ اتنا ڈرا کہ اس کا خون جمنے لگا۔ مگر اسے الیاب یاد آیا کہ ڈر سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا۔ اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا۔ اور اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ اپنے مسخ ہم ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا۔ تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی اس نے ان کی لال بھبوکا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے ہوئے جسموں کو دیکھا اور نفرت سے

اس کا بگڑنے لگا۔ مگر اسے اچانک زبان کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے
ت اس کی مسخ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ الیاسف نفرت مت کر کہ نفرت سے
ی کی کایا بدل جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔
الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا اور کہا کہ بے شک میں انھیں میں سے
۔ اور اس نے وہ دن یاد کئے۔ جب وہ ان میں سے تھا۔ اور دل اس کا محبت کے
ش سے امنڈنے لگا۔ اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کی دودھیا
ڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی۔ اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور
یاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے۔ کہ وہ سرو کے
ل اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا۔ اور چھپر کھٹ کے لئے
ے ٹٹولا جس کے لئے اس کا جی چاہتا تھا۔ اور اس نے دیکھا لمبے بال اس کی رات
بوندوں سے بھیگے ہوئے ہیں۔ اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں۔
ر پیٹ اس کا گندم کی ڈھیری کی مانند ہے اور پاس اس کے صندل کا گول
لہ ہے اور الیاسف نے بنت الاخضر کو یاد کیا۔ اور ہرن کے بچوں اور گندم کی
ھیری اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرو کے دروازوں اور صنوبر کی کڑیوں
لے گھر تک گیا۔ سا اس نے خالی مکان کو دیکھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لئے
ں کا جی چاہتا تھا۔ اور پکارا کہ اے بنت الاخضر! تو کہاں ہے اور اے وہ کہ
ں کے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ دیکھ موسم کا بھاری نہیں۔ گزر گیا اور پھولوں کی
یاریاں ہری بھری ہو گئیں۔ اور قمریاں اونچی شاخوں پر پھڑپھڑاتی ہیں۔ تو
کہاں ہے؟ اے اخضر کی بیٹی! اے اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر آرام
کرنے والی تجھے دشت میں دوڑتی ہوئی ہرنیوں اور چٹانوں کی دراڑوں میں
چھپے ہوئے کبوتروں کی قسم تو نیچے اتر آ۔ اور مجھ سے آن مل کہ تیرے لئے میرا جی چاہتا

ہے۔ الیاسف بار بار پکارتا۔ کہ اس کا جی بھر آیا۔ اور بنت الاخضر کو یاد کر کے

الیاسف بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا مگر اچانک اسے الیعذر کی جورو
آئی۔ تو الیعذر کو بندر کی جون میں دیکھ کر روئی تھی۔ حالاں کہ اس کی ہڑکی بڑ
گئی اور بہتے آنسوؤں میں اس کے جمیل نقش بگڑتے چلے گئے۔ اور ہڑکی آو
وحشی ہوتی چلی گئی ـــــ یہاں تک کہ اس کی جون بدل گئی۔ تب الیاسف۔
خیال کیا۔ بنت الاخضر جن میں سے تھی اُن میں مل گئی۔ اور بے شک جو جن میں
ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا کہ اے الیاس
ان سے محبت مت کر مبادا تو ان میں سے ہو جائے۔ اور الیاسف نے محبت۔
کنارہ کیا۔ اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ اور الیاس
ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کو فراموش کر دیا

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھبوکا صو
اور کھڑی دم کو دیکھ کر ہنسا اور الیاسف کو الیعذر کی جورو یاد آئی کہ وہ اُس
قریے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاڑ کے درخت کی مثال تھی۔ اور چھاتیا
اس کی انگور کے خوشوں کی مانند تھیں۔ اور الیعذر نے اس سے کہا تھا کہ جاو
میں انگور کے خوشے توڑوں گا۔ اور انگور کے خوشوں والی تڑپ کر ساحل کی د
نکل گئی۔ الیعذر اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور تاڑ کے درخت کو ا
گھر لے آیا۔ اور اب وہ ایک اونچے کنگرے پر الیعذر کی جورو بن بنا کر کھا
بیٹھی۔ الیعذر جھرجھری لے کر کھڑا ہو جاتا۔ اور وہ دُم کھڑی کر کے اپنے لمبے بازوں
اٹھ بیٹھی اس کے ہنسنے کی آواز اتنی اونچی ہوئی کہ اسے ساری بستی گونجتی معلوم ہوئی۔ ا
وہ اپنے اتنی زور سے ہنسنے پر حیران ہوا۔ مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا۔
ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا۔ اے الیاسف

ان پرست جنس مبادا تو جنسی کی ایسی بھی جانے اور الیاسف نے جنسی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے جنسی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے غصہ اور ہمدردی سے رونے اور ہنسنے سے ہر کیفیت سے گزر گیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کران سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اچکنا۔ دانت پیس پیس کر کلکاریاں کرنا۔ کچے پکے پھلوں پر لڑنا۔ اور ایک دوسرے کو لہو لہان کر دینا۔ یہ سب کچھ اسے آگے کبھی ہم جنسوں پر رلاتا تھا۔ کبھی ہنساتا تھا۔ کبھی غصہ دلاتا کہ وہ ان پر دانت پیسنے لگتا۔ اور انھیں حقارت سے دیکھتا۔ اور یوں ہوا کہ انھیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصہ کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا۔ پھر خود ہی اپنی آواز پر حیران ہوا۔ اور کسی کسی بندر نے اُسے بے تعلقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جُٹ گیا۔ اور الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی۔ کہ وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے۔ اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ اس لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا۔ اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے۔ آج لفظ مر گیا۔ اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا۔ اور خاموش ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے، غصے اور ہمدردی سے، ہنسنے اور رونے سے در گذرا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے کنارہ کیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر جزیرے کے مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق، گہرے پانیوں کے درمیان خشکی کا ننھا سا نشان اور جزیرے نے کہا کہ میں گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند

رکھوں گا۔

الیاسف اپنے تئیں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنا لیا کہ محبت اور نفرت۔ غصہ اور ہمدردی غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں۔ کہ جذبے کی کوئی رَو اسے بہا کر نہ لے جائے اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کرنے لگا۔ پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکرمند ہو کر کہا کہ اے معبود کیا میں اندر سے بدل رہا ہوں تب اس نے اپنے باہر پر نظر کی اور اسے گمان ہونے لگا کہ وہ پتھری پھیل کر باہر آ رہی ہے۔ کہ اس کے اعضا رخوش، اس کی جلد بدرنگ اور اس کا لہو بے رس ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وسوسوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھکتا جا رہا ہے۔ اور بال بدرنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ تب اسے اپنے بدن سے خوف آیا۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خوف سے وہ اپنے اندر سمٹنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ٹانگیں اور بازو مختصر اور چھوٹا ہوتا جا رہا ہے تب اسے مزید خوف ہوا۔ اور اعضا اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے اور اس نے سوچا کہ کیا میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر بن گیا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں اندر کے خوف پر اسی طور غلبہ پاؤں گا جس طور میں نے باہر کے خوف پر غلبہ پایا تھا۔ اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پا لیا۔ اور اس کے سمٹتے ہوئے اعضا رکھلنے اور پھیلنے لگے۔ اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے۔ اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے چپٹے اور مجیبی ہو گئے۔ اور اس کے جوڑ کھلنے لگے۔ اور الیاسف کو گمان ہوا کہ اس کے سارے اعضا بکھر جائیں گے تب اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کو بھینچا اور

ٹھیاں کس کر باندھیں۔ اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے بد ہیئت اعضاء کی تاب نہ لاکر آنکھیں بند کر لیں اور جب لیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضاء کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کیا میں میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اس کا ڈھپنے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کیا میں میں نہیں رہا ہوں اس خیال سے دل اس کا ڈھپنے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھولی۔ اور چپکے سے اپنے اعضاء پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی کہ اس کے اعضا تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بے شک میں اپنی جون میں ہوں۔ مگر اس کے بعد آپ ہی آپ اسے پھر وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے اعضاء بگڑتے اور بدلتے جا رہے ہیں اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنویں میں دھنستا جا رہا ہے اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے میرے معبود میرے باہر بھی دوزخ ہے۔ اندھیرے کنویں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اور گزری راتیں محاصرہ کرنے لگیں۔ الیاسف کو سبت کے دن ہم جنسوں کا مچھلیوں کا شکار کرنا یاد آیا کہ ان کے ہاتھوں مچھلیوں سے بھرا سمندر مچھلیوں سے خالی ہونے لگا۔ اور ان کی ہوس بڑھتی گئی۔ اور انھوں نے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا۔ تب اس شخص نے جو انھیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کرتا تھا کہا کہ رب کی سوگند جس نے سمندر کو گہرے پانیوں والا بنایا اور گہرے پانیوں کی مچھلیوں کا مامن ٹھہرایا سمندر تمھارے دست ہوس سے پناہ

مانگتا ہے اور سبت کے دن مچھلیوں پر ظلم کرنے سے باز رہو کہ مبادا تم اپنی جانوں پہ ظلم کرنے والے قرار پاؤ۔ الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا۔ اور الیاسف عقل کا پتلا تھا۔ سمندر سے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے ملایا اور سبت کے دن مچھلیاں سطح آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے پر نکل گئیں۔ اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص خود سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر یوں بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا۔ اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے۔ اور الیاسف یہ یاد کر کے پچھتایا اور وسوسہ کیا کہ کیا وہ مکر میں گھر گیا ہے۔ اس گھڑی اسے اپنی پوری ہستی ایک مکر نظر آئی۔ تب وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ پیدا کرنے والے تو نے مجھے ایسا پیدا کیا جیسا پیدا کرنے کا حق ہے۔ تو نے مجھے بہترین کینڈے پر خلق کیا۔ اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اے پیدا کرنے والے کیا تو اب مجھ سے مکر کرے گا۔ اور مجھے ذلیل بندر کے اسلوب پر ڈھالے گا۔ اور الیاسف اپنے حال پر رویا۔ اس کے بنائے پشتہ میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ اور سمندر کا پانی جزیرے میں آ رہا تھا۔

الیاسف اپنے حال پر رویا اور بندروں سے بھری بستی سے منہ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا۔ کہ اب بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آتی تھی اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اس کے لئے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے درخت کی ٹہنیوں پر چھپ کر بسر کی۔

جب صبح کو وہ جاگا تو اس کا سارا بدن دکھتا تھا اور ریڑھ کی ہڈی د کرتی تھی۔ اس نے اپنے بگڑے اعضا پر نظر کی۔ کہ اس وقت کچھ زیادہ بگڑے بگڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کیا میں میں ہی ہوں اور اس آ

اسے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بےشک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے کہ آدمی آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اور جو جن میں سے ہے ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندوہ سے بھر گئی۔ اور وہ پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھ بن میں ادھورا ہوں۔
اس آن الیاسف کو ہرن کے تڑپتے ہوئے بچوں اور گندم کی ڈھیری۔ اور صندل کے گول پیالے کی یاد بے طرح آئی۔ جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈا چلا آرہا تھا۔ اور الیاسف نے درد سے صدا کی کہ اے بنت الاخضر اے وہ شخص کے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ تجھے میں اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑتی دودھیا گھوڑیوں کی قسم ہے۔ قسم ہے کبوتروں کی جب وہ بلندیوں پر پرواز کرے۔ قسم ہے تجھے رات کی جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہے تجھے رات کے اندھیرے کی۔ جب وہ بدن میں اترنے لگے۔ قسم ہے تجھے اندھیرے اور نیند کی۔ اور پلکوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں۔ تو مجھے آن مل کہ تیرے لئے میرا جی چاہتا ہے اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ جیسے زنجیر الجھ گئی ہو۔ جیسے لفظ مٹ رہے ہوں۔ جیسے اس کی آواز بدلتی جا رہی ہو۔ اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پر غور کیا اور ابن زبلون اور الیاب کو یاد کیا کہ کیونکر ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئی تھیں۔ الیاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ اے کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت انہونا نظر آیا۔ اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں نہیں بدلا ہوں۔

الیاسف نے پہلے بستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے نمائف ہو گیا۔ اور الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے کے خیال سے خائف چلتے چلتے جنگل میں دور نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا۔ جی ٹھنڈا کیا۔ اسی اثنا میں وہ موتی ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آ لیا۔ اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آ لیا تھا۔ اور وہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے۔ اور چیپٹے ہونے لگے۔ اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ مگر وہ بھاگتا گیا۔ اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا جاتی ہے۔ اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دی اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیز کے موافق چلا۔

○

قرۃ العین حیدر

۱

نظارہ درمیاں ہے

تارا بائی کی آنکھیں تاروں ایسی روشن ہیں اور وہ گرد و پیش کی ہر چیز کو حیرت سے تکتی ہے۔ دراصل تارا بائی کے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ وہ قحط کی سوکھی ماری لڑکی ہے جسے بیگم الماس خورشید عالم کے ہاں کام کرتے ہوئے صرف چند ماہ ہوئے ہیں اور وہ اپنی مالکن کے ثروت دار فلیٹ کے ساز و سامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے کہ ایسا عیش و عشرت اس سے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا! وہ گورکھپور کے ایک گاؤں کی بال ودھوا ہے جس کے سسر اور ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے ماما نے جو بمبئی میں دودھ والا بھیا ہے اسے یہاں بلا بھیجا تھا۔

الماس بیگم کے بیاہ کو بھی ابھی تین چار مہینے ہی گذرے ہیں۔ ان کی منگلورین آیا جو ان کے ساتھ آئی تھی "ملک" چلی گئی تو ان کی بے حد منتظم خالہ بیگم عثمانی نے، جو ایک نامور سوشل ورکر ہیں، ایمپلائمنٹ ایکسچینج فون کیا اور تارا بائی پیٹ بجنے کی طرح آنکھیں جھپکاتی کمبالا ہل کے اسکائی اسکریپر "گل فشاں" کی دسویں منزل پر آن پہنچیں۔ الماس بیگم نے ان کو ہر طرح قابل اطمینان پایا۔ مگر دوسرے ملازموں نے ان کو تارا بائی کہہ کر پکارا تو وہ بہت بگڑیں۔ "ہم کوئی بیسوا ہیں—؟" انھوں نے احتجاج کیا۔ مگر اب ان کو تارا بائی کے بجائے تارا دائی کہلانے کی عادت ہو گئی ہے۔

اور وہ چپ چاپ کام میں مصروف رہتی ہیں اور بیگم صاحب اور ان کے صاحب کو آنکھیں چھپکا چھپکا کر دیکھا کرتی ہیں۔

الماس بیگم کا اگر بس چلے تو وہ اپنے طرح دار شوہر کو ایک لمحے کے لئے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور وہ جوان جہان آیا کو ملازم رکھنے کی ہرگز قائل نہیں۔ مگر تارا بائی جیسی بے جان اور سگھڑ خادمہ کو دیکھ کر انھوں نے اپنی تجربہ کار خالہ کے انتخاب پر اعتراض نہیں کیا۔

تارا بائی صبح کو بیڈ روم میں چائے لاتی ہے۔ بڑی عقیدت سے صاحب کے جوتوں پر پالش اور کپڑوں پر استری کرتی ہے۔ ان کے شیو کا پانی لگاتی ہے۔ جھاڑ پونچھ کرتے وقت وہ بڑی حیرت سے ان خوبصورت چیزوں پر ہاتھ پھیرتی ہے جو صاحب اپنے ساتھ پیرس سے لائے ہیں۔ ان کا وائلن وارڈ روب کے اوپر رکھا ہے۔ جب پہلی بار تارا بائی نے بیڈ روم کی صفائی کی تو وائلن پر بڑی دیر تک ہاتھ پھیرا کی۔ مگر پرسوں صبح حسب معمول جب وہ بڑی نفاست سے وائلن صاف کر رہی تھی تو نرم مزاج اور شریف صاحب (بیگم صاحب یقیناً مرچ ہیں) اسی وقت کمرے میں آ گئے اور اس پر برس پڑے کہ وائلن کو ہاتھ کیوں لگایا اور تارا بائی کے ہاتھ سے چھین کر اسے الماری کے اوپر پٹخ دیا۔ تارا بائی سہم گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور صاحب ذرا شرمندہ سے ہو کر باہر برآمدے میں چلے گئے، جہاں بیگم صاحب بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ ویسے بیگم صاحب کی صبحیں ہیئر ڈریسر اور بیوٹی سیلونوں میں گزرتی ہیں۔ مینی کیور، پیڈی کیور، ناچ، نیشنل ——— ایک سے ایک بڑھیا ساڑیاں، درجنوں رنگ برنگے سلیکس اور عطر کے ڈبے اور گنے ان کی الماریوں میں پٹے پڑے ہیں، دیکھ کر تارا بائی سوچتی ہے۔ "بھگوان نے میم صاحب کو دولت بھی، ایجت بھی اور ایسا سندر پتی بھی۔ بس شکل دینے میں کنجوسی کر گئے۔"

صاحب سنا ہے میم صاحب مس صاحب لوگ کی سوسائٹی میں بے حد مقبول تھے۔ مگر بیاہ کے بعد بیگم صاحب نے ان پر بہت سی پابندیاں لگا دی ہیں۔ دفتر جاتے ہیں تو دن میں کئی بار فون کرتی ہیں شام کو کسی کام سے باہر جائیں تو بیگم صاحب کو پتہ رہتا ہے کہ کہاں کہاں گئے ہیں اور ان مچھوں پر

فون کرتی رہتی ہیں۔ شام کو سیر و تفریح یا ملنے ملانے کے لئے دونوں میاں بیوی باہر جاتے ہیں تب بھی بیگم صاحب بڑی کڑی نگرانی رکھتی ہیں۔ مجال ہے جو وہ کسی دوسری لڑکی پر نظر بھی ڈال لیں۔

صاحب نے یہ سارے قاعدے قانون ہنسی خوشی قبول کر لئے ہیں کیونکہ بیگم صاحب بہت امیر ہیں اور صاحب کی نوکری بھی ان کے دولت مند سسر ہی نے دلوائی ہے ورنہ بیاہ سے پہلے صاحب بہت غریب آدمی تھے۔ اسکالرشپ پر انجینیرنگ پڑھنے فرانس گئے تھے۔ واپس آئے تو روزگار نہیں ملا۔ پریشان حال گھوم رہے تھے جب ہی بیگم صاحب کے گھر والوں نے انھیں پھانس لیا۔

بڑے لوگوں کی دنیا کے یہ عجیب و غریب قصے تارا بائی فلیٹ کے مستری (باورچی) حمال اور دوسرے نوکروں سے سنتی اور اس کی آنکھیں اچنبھے سے جھلملاتی رہتی ہیں۔

خورشید عالم بڑے اچھے وائلن نواز بھی تھے، مگر جب سے بیاہ ہوا ہے، بیوی کی محبت میں ایسے کھوئے کہ وائلن ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ الماس بیگم کو اس سازسے دلی نفرت ہے۔ خورشید عالم بیوی کے بے حد احسان مند ہیں کیونکہ اس شادی سے ان کی زندگی بدل گئی اور احسان مندی ایسی شے ہے کہ ایک سنگیت کار اپنی سنگیت کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ خورشید عالم شہر کی ایک خستہ عمارت میں پڑے تھے اور بسوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اب لکھ پتی کی حیثیت سے کمبالا ہل میں فروکش ہیں۔ مرد کے لئے اس کا اقتصادی تحفظ غالباً سب سے بڑی چیز ہے۔

خورشید عالم اب وائلن کبھی نہیں بجائیں گے۔

یہ صرف ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ الماس اپنے ملک التجار باپ کی عالی شان کوٹھی میں مالابار ہل پر رہتی تھیں۔ وہ سوشل ورک کر رہی تھیں اور عمر زیادہ ہو جانے کے کارن شادی کی امید سے دست بردار ہو چکی تھیں۔ جب ایک دعوت میں ان کی ملاقات خورشید عالم سے ہوئی اور ان کی جہاں دیدہ خالہ بیگم عثمانی نے ممکنات بھانپ کر اپنے جاسوسوں کے ذریعہ معلومات فراہم کیں ——— لڑکا یہ پی کا ہے۔ یورپ سے لوٹ کر تلاش معاش میں سرگرداں ہے، مگر شادی پر تیار نہیں کیونکہ فرانس میں ایک لڑکی چھوڑ آیا ہے اور اس کی آمد کا منتظر ہے۔ بیگم عثمانی فوراً اپنی مہم پر جٹ گئیں۔ الماس کے

والدنے اپنی ایک فرم میں خورشید عالم کو پندرہ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ الماس کی والدہ نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا اور الماس سے ملاقاتیں خود بخود شروع ہوگئیں۔ مگر پھر بھی لڑکے نے "لڑکی" کے سلسلے میں کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ دفتر سے لوٹ کر بیشتر وقت انھیں الماس کے ہاں گزارنا پڑتا اور اس لڑکی کی سطحی گفتگو سے اکتا کر اس پُرفضا بالکنی میں جا کھڑے ہوتے جس کا رُخ سمندر کی طرف تھا۔ پھر وہ سوچتے ایک دن "اُس" کا جہاز آکر اس ساحل سے لگے گا اور "وہ" اس میں سے اُترے گی۔ اسے ہر لمحہ آجانا چاہئے تھا مگر پیرس میں کالج میں اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ "اُس" کا جہاز اس ساحل سے آ لگے گا ——— وہ بالکنی کے جنگلے پر جھکے افق کو تکتے رہتے۔ الماس اندر سے نکل کر شگفتگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی: "کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ ذرا جھینپ کر مسکرا دیتے۔

رات کے کھانے پر الماس کے والد کے ساتھ ملکی سیاست سے وابستہ ہائی فنانس پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد وہ تھکے ہارے اپنی جائے قیام پر پہنچتے اور وائلن نکال کر دھنیں بجانے لگتے جو "اس" کی سنگت میں پیرس میں بجایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہر تیسرے دن ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے اور پچھلے خط میں انھوں نے "اسے" اطلاع دی تھی کہ انھیں بمبئی ہی میں بڑی عمدہ ملازمت مل گئی ہے۔ اس ملازمت کے ساتھ جو خوفناک شاخسانے بھی تھے اس کا ذکر انھوں نے خط میں نہیں کیا تھا۔

ایک برس گزر گیا مگر انھوں نے الماس سے شادی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ آخر عثمانی بیگم نے طے کیا کہ خود ہی ان سے صاف صاف بات کر لینا اب عین مناسب ہے۔ مگر تب ہی پرتاپ گڑھ سے تار آیا کہ خورشید عالم کے والد سخت بیمار ہیں اور وہ بمبئی سے کر وطن روانہ ہوگئے۔

ان کو پرتاپ گڑھ گئے چند روز ہی گزرے تھے کہ الماس جواب ان کی طرف سے ناامید ہو چکی تھی ایک شام اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک جرمن پیانسٹ کا کونسرٹ سننے تاج محل گئی۔ کرسٹل روم میں حسب معمول بوڑھے پارسیوں اور پارسنوں کا مجمع تھا اور ایک حسین آنکھوں والی پارسی لڑکی کنسرٹ کا پروگرام بانٹتی پھر رہی تھی۔ ایک شناسا خاتون نے الماس کا تعارف اس

ا سے کرایا۔" مس پیروجا جہانگیر دستور ــــــــ" اور خود آگے چلی گئیں۔
الماس نے حسب عادت بڑی ناقدانہ اور تیکھی نظروں سے اس اجنبی لڑکی کا جائزہ لیا۔
بے حد حسین تھی۔
"آپ کا نام کیا بتلایا مسز رستم جی نے؟" الماس نے ذرا مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔
"پیروجا دستور۔" لڑکی نے سادگی سے جواب دیا۔
"میں نے آپ کو پہلے کسی کونسرٹ وغیرہ میں نہیں دیکھا۔"
"میں سات برس بعد پچھلے ہفتے ہی پیرس سے واپس آئی ہوں۔"
"سات برس پیرس میں! تب تو آپ فرنچ خوب فرفر بول لیتی ہوں گی۔" الماس نے ذرا
ہی سے کہا۔
"جی ہاں ــ" پیروجا ہنسنے لگی۔
اب خاص خاص مہمان جرمن پیانسٹ کے ہمراہ لاؤنج کی سمت بڑھ رہے تھے۔ پیروجا الماس
ندرت چاہ کر ایک انگریز خاتون سے اس پیانسٹ کی موسیقی پر بے حد ٹکنیکل قسم کا تبصرہ کرنے میں
ہو گئی لیکن اسی لاؤنج میں پہنچ کر الماس پھر اس لڑکی سے ٹکرا گئی۔ کمرے میں چائے کی گہما گہمی
ہو چکی تھی۔
"آئیے یہاں بیٹھ جائیں۔" پیروجا نے مسکرا کر الماس سے کہا۔ وہ دونوں دریچے سے لگی
یک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔
"آپ تو ویسٹرن میوزک کی ایکسپرٹ معلوم ہوتی ہیں۔ الماس نے ذرا رکھائی سے بات
کی کیونکہ وہ خوب صورت اور کم عمر لڑکیوں کو ہرگز برداشت نہ کر سکتی تھی۔
"جی ہاں، میں پیرس میں پیانو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہی گئی تھی۔"
الماس کے ذہن میں کہیں دور خطرے کی گھنٹی بجی۔ اس نے باہر سمندر کی شفاف اور بے حد
لم پر نظر ڈال کر دفعتاً بڑے اخلاق اور بے تکلفی سے کہا۔" ہاؤ انٹرسٹنگ ــــــــ پیانو تو

ہمارے یہاں بھی موجود ہے۔ کسی روز آکر کچھ سناؤ۔"

"ضرور۔" پیردجا نے مسرت سے جواب دیا۔

"سنیچر کے روز کیا پروگرام ہے تمہارا۔ میں اپنے ہاں ایک ٹی پارٹی (PARTY کر رہی ہوں۔ میری سہیلیاں تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

"آئی وڈ لو ٹو کم ——— تھینک یو۔"

"تم رہتی کہاں ہو پیردجا؟"

پیردجا نے تاردیو کی ایک گلی کا پتہ بتایا۔ الماس نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ متوسط الحال پارسیوں کا محلہ ہے۔

"میں اپنے چچا کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے کوئی بھا بھی نہیں۔ مجھے چچا ہی نے پالا ہے۔ وہ لاولد ہیں۔ چچا ایک بینک میں کلرک ہیں۔ پیردجا ساد کہتی رہی۔ پھر ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد سمندر کی پرسکون سطح کو دیکھتے ہوئے اس نے اچ "کیسی عجیب بات ہے۔ پچھلے ہفتے جب میرا جہاز اس ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں سوچ رہ اتنے عرصے کے بعد اجنبیوں کی طرح بمبئی واپس پہنچ رہی ہوں۔ یہ بڑا کٹھور شہر ہے۔ تم کو معلوم ہ الماس! مخلص دوست یہاں بہت مشکل سے ملتے ہیں مگر میری خوش قسمتی دیکھو کہ آج ہی تم سے ملا

الماس نے دانشمندی کے ساتھ سر ہلایا۔ سی لاؤنج میں باتوں کی دھیمی دھیمی بھنبھ جاری تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا "تم پیرس کیسے گئیں؟"

"مجھے اسکالرشپ مل گیا تھا۔ وہاں پیانو کی ڈگری لینے کے بعد چند سال تک م کالج میں ریسرچ کرتی رہی۔ میں وہاں بہت خوش تھی۔ مگر میرے چچا چچی یہاں بالکل دونوں بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ چچی بیچاری تو ضعیف العمری کی وجہ بالکل بہری بھی ہو میں ان کی خاطر واپس آگئی اور اس کے علاوہ۔۔۔۔۔۔"

"ہلو الماس! تم یہاں بیٹھی ہو! چلو جلدی۔ مسز ملگاؤنکر تم کو بلا رہی ہیں۔ ایک ن

پاس آکر کہا۔ پیروجا کی بات ادھوری رہ گئی۔ الماس نے اس سے یہ بات کہتے ہوئے معذرت کر کہ وہ سنیچر کو صبح گیارہ بجے اس کے لئے کار بھیج دے گی۔ وہ میز سے اٹھ کر مہمانوں کے مجمع ہو گئی۔

سنیچر کے روز پیروجا الماس کے گھر پہنچی جہاں مرغیوں کی پارٹی اپنے عروج پر تھی بیٹلز ریکارڈ بج رہے تھے۔ چند لڑکیاں جنھوں نے چند روز پہلے ایک فیشن شو میں حصہ لیا تھا۔ ور سے اس کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ یہ سب لڑکیاں جن کی ماتری بھاشائیں اردو گجراتی اور مراٹھی تھیں، انگریزی اور صرف انگریزی بول رہی تھیں اور انھوں نے بے حد پتلونیں یعنی اسٹریچ پینٹس پہن رکھی تھی —— پیروجا کو ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا ابھی ہندوستان واپس نہیں آئی ہے۔ اس کا اپنا فرقہ بے حد مغرب پسند تھا مگر برسوں یورپ ہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اجنتا کی زندہ تصویروں کی بجائے ان مغربیت زدہ ہندوستانی ن کو دیکھ کر اہل یورپ کو سخت افسوس اور مایوسی ہوتی ہے۔ چنانچہ پیروجا جہانگیر دستور برن روم میں اپنی ٹھیٹھ ہندوستانی وضع قطع پر بڑی نازاں رہتی تھی۔ بمبئی کی ان نقلی امریکن ں سے اکتا کر وہ بالکنی میں جا کھڑی ہوئی جس کے سامنے سمندر تھا اور پہلو میں [illegible] جنگل نظر آرہا تھا۔ وہ چونک اٹھی گھنے جنگل کے اوپر کھلی فضاؤں میں چند گدھ اور کوے لا رہے تھے اور چاروں طرف بڑا ڈراؤنا سناٹا طاری تھا۔ وہ گھبرا کر واپس پہنچی اور زندگی دہکتے ہوئے کمرے میں آکر ایک صوفے پر ٹک گئی۔

کمرے کے ایک کونے میں غالباً بطور آرائش اسٹین وے کا گرینڈ پیانو رکھا ہوا تھا۔ لڑکیاں ریڈیوگرام پر ہیری بیلا فونٹے کا پرانا کلیپسو "جمیکا فیرویل" بجا رہی تھیں۔ مغنی کی دل کش آواز گٹار جان لیوا گونج کمرے میں پھیلنے لگی:

DOWN THE WAY WHERE THE NIGHTS ARE GAY AND

SUN SHINES DAILY ON THE MOUNTAIN TOP I TOO

TRIP ON A SAILING SHIP.

WHEN I REACHED JAMAICA I MADE A STOP BUT

M SAD TODAY I AM ON MY WAY AND WON'T BE BACK

MANY A DAYS:

HAD TO LEAVE A LITTLE GIRL IN KINGSTON TOWN.

الماس چپ چاپ جاکر بالکنی میں کھڑی ہو گئی۔ ریکارڈ ختم ہوا تو اس نے اندر پیرد جا سے کہا "ہم لوگ سخت بدمذاق ہیں۔ ایک ماہر پیانسٹ یہاں بیٹھی ہے اور ہم ریکارڈ بجا رہے ہیں۔ چلو بھائی ــــ اٹھو"

پیرد جا مسکراتی ہوئی پیانو کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"کیا سناؤں؟ میں تو صرف کلاسیکی میوزک ہی بجاتی ہوں"

"ہائے ــــ پوپ (POP) نہیں؟ لڑکیوں نے غل مچایا ــــ "اچھا کوئی فلم سانگ ہی بجاؤ"

"فلم سانگ بھی مجھے نہیں آتے ــــ مگر ــــ مگر ایک غزل یاد ہے ــــ مجھے ــــ جو مجھے ــــ وہ جھینپ کر ٹھٹک گئی۔

غزل ــــ؟ اوہ! آئی لو اُردو پوئیٹری ــــ" ایک مسلمان لڑکی نے جس کے اہلِ زبان تھے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔

پیرد جانے پردوں پر انگلیاں پھیریں اور ایک انجانی، مسرور پھریری سی پھر اس نے آہستہ آہستہ ایک دل کش دُھن بجانا شروع کی۔

"گاؤ بھی ساتھ ساتھ" لڑکیاں چلائیں۔

"بھئی میں گا نہیں سکتی۔ میرا اُردو تلفظ بہت خطرناک ہے"

"اچھا اس کے الفاظ بتلادو ــــ" ہم لوگ گائیں گے"

"وہ کچھ اس طرح ہے ——" پیروجا نے کہا۔

"تو سامنے ہے اپنے بتلا کر تو کہاں ہے
کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے"

چند لڑکیوں نے ساتھ ساتھ گانا شروع کر دیا۔ نظارہ درمیاں ہے — نظارہ درمیاں ہے۔

غزل ختم ہوئی تالیاں بجیں۔

"اب کوئی ویسٹرن چیز بجاؤ ——" ایک لڑکی نے فرمائش کی۔

"شوپاں کی میڈنز فینسی (MAIDEN'S FANCY) بجاؤں؟ یہ نغمہ میں اور میرا منگیتر ہمیشہ اکٹھے بجاتے تھے پیرس میں۔ وہ وائلن پر میری سنگت کرتے تھے ——"

"تمہارے منگیتر بھی میوزیشین ہیں؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"پیروفیشنل نہیں۔ شوقیہ۔" پیروجا نے جواب دیا اور نغمہ بجانے میں محو ہو گئی۔

اگلے دو ہفتوں میں الماس نے پیروجا سے بڑی گہری دوستی گانٹھ لی۔ اس دوران میں پیروجا کو ایک کانونٹ کالج میں پیانو سکھلانے کی نوکری مل چکی تھی جو تعطیلات کے بعد ملنے والا تھا۔ ہفتے میں تین بار ایک امریکن کی دس سالہ لڑکی کو پیانو سکھانے کا ٹیوشن بھی اسے مل گیا تھا۔ امریکن کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور وہ اپنا غم بھلانے کے لئے اپنے بچوں کے ہمراہ بغرض سیاحت ہندوستان آیا ہوا تھا اور جوہو میں سن اینڈ سینڈ میں مقیم تھا۔ تاردیو سے جوہو کا سفر خاصا طویل تھا مگر امریکن پیروجا کو اچھی تنخواہ دینے والا تھا اور بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ پیروجا اپنی زندگی سے فی الحال بہت خوش تھی۔ چند روز بعد "وہ" اپنے وطن سے واپس آنے والا تھا۔ پیروجا نے اسے بمبئی آتے ہی ملازمت اور ٹیوشن ملنے کی اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ "اسے" ایک اچانک "سرپرائز" دینا چاہتی تھی۔

ایک روز وہ الماس کے ساتھ اس کی کوٹھی کے باغ میں ٹہل رہی تھی کہ فوارے پر بیٹھ کر الماس نے اس سے دفعتاً سوال کیا۔ "تم نے وہ غزل کہاں سے سیکھی تھی ——

"اوہ ـــــ وہ ـــــ ؟ پیرس میں !"

"پیرس ! ہاؤ انٹرسٹنگ ! کس نے سکھائی ؟"

"میرے منگیتر نے ـــــ"۔

"اوہ پیردجا ـــــ یو ڈارک ہورس ـــــ ! چار سو بیس ! مجھ کو بتایا بھی نہیں اب تک !"

"تمھاری ہی کمیونٹی کے ہیں وہ ـــــ"

"اوہ ـــــ واقعی ـــــ ؟" الماس خوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

"میرے باپ دادا دستور سے تھے مگر میرے چچا بہت روشن خیال ہیں۔ انھوں نے اجازت دے دی ہے۔"

"کیا نام ہے صاحب زادے کا ؟"

"یہ ناموں کا بھی عجیب قصہ تھا۔ خورشید عالم اس کی نرگسی آنکھوں پر عاشق ہوئے تھے۔ جب پیرس کے ہندوستانی سفارت خانے کی ایک تقریب میں پہلی ملاقات ہوئی اور کسی نے اس کا تعارف "پیردجا" کہہ کر ان سے کرایا تو انھوں نے شرارت سے کہا تھا۔ لیکن آپ کا نام نرگس ہونا چاہیے تھا۔ !" "اوہ نرگیش ؟ نرگیش تو میری آنٹی کا نام ہے"۔

"لاحول ولا قوۃ ـــــ" خورشید عالم نے ایسی بے تکلفی سے کہا تھا جیسے اسے ہمیشہ سے جانتے ہوں ـــــ "نرگیش، کھورشیٹ، پیردجا۔ آپ لوگوں نے حسین ایرانی ناموں کی پڑھ ماری ہے۔ میں آپ کو فیروزہ پکاروں تو کوئی اعتراض ہے ؟" ـــــ "ہرگز نہیں ـــــ" پیردجا نے ہنس کر جواب دیا تھا ـــــ اور پھر ایک بار خورشید عالم نے دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے اس سے کہا تھا۔" یہ تمھاری بہادر آنکھیں ـــــ ہفت زبان آنکھیں، جگنو ایسی شہاب ثاقب ایسی، ہیرے جواہرت ایسی، روشن دھوپ اور جھلملاتی بارش ایسی آنکھیں ـــــ نرگس کے پھول جو تمھاری آنکھوں میں تبدیل ہو گئے۔"

"میں نے پوچھا" کیا نام ہے ان صاحب کا؟" الماس کی تیکھی آواز پر وہ چونکی۔
"کھور شید عالم" اس نے جواب دیا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد اس نے گھبرا کر
س اٹھائیں۔ سیاہ ساری میں ملبوس، کمر پر ہاتھ رکھے، سیاہ اونٹ کی طرح اس کے سامنے
ی الماس اس سے کہہ رہی تھی "کیسا عجیب اتفاق ہے پیروجا ڈیر! میرے منگیتر کا
بھی خورشید عالم ہے وہ بھی وائلن بجاتے ہیں، وہ بھی پیرس سے آئے ہیں اور ان دنوں
، والد سے ملنے دہلی گئے ہوئے ہیں۔

اگست کے آسمان پر زور سے بجلی چمکی مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کڑکتی ہوئی بجلی
ن کر پیروجا دستور پر گر گئی۔ وہ کچھ دیر تک ساکت بیٹھی رہی پھر اس نے اس عالی شان
رت پر نظر ڈالی اور اپنے تاردیو کے فلیٹ کا تصور کیا، بجلی پھر چمکی اور مالابار ہل کے اس
طر کو روشن کر گئی۔ چشم زدن میں ساری بات پیروجا کی سمجھ میں آ گئی۔ اور یہ بھی کہ اپنے خطوں
ں خورشید عالم نے الماس کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا اور کچھ عرصے سے شادی کے تذکرہ کو وہ
پنے خطوط میں کس وجہ سے ٹال رہے تھے۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور اس نے آہستہ سے کہا۔
چھا بھئی الماس، منگنی مبارک ہو۔ خدا حافظ"

"جا رہی ہو پیروجا؟ ٹھہرو، میری کار تم کو پہنچا آئے گی ـــــ ڈرائیور ـــــ" الماس
ے سکون کے ساتھ آواز دی۔

"نہیں الماس شکریہ"۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پھاٹک سے نکلی۔ سڑک کے دوسری طرف
ی وقت بس آن کر رکی۔ وہ تیزی سے سڑک پار کر کے بس میں سوار ہو گئی۔

فوارے کے پاس کھڑی الماس پھاٹک کی طرف دیکھتی رہی۔ بارش کی زبردست بوچھار نے
ام کے درختوں کو جھکا جھکا دیا۔ وہ جلدی سے قدم اٹھاتی کیچڑ سے بچتی برساتی کے اندر چلی گئی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز خورشید عالم کا خط الماس کے والد کے نام آیا جس میں
انھوں نے اپنے ابا میاں کی شدید علالت کی وجہ سے رخصت کی میعاد بڑھانے کی درخواست

کی تھی۔ انھوں نے الماس کے والد کو یہ نہیں لکھا کہ اس خبر سے کہ ان کا اکلوتا لڑکا کسی مسلما
رئیس زادی کے بجائے کسی پارسن سے شادی کر رہا ہے ـــــ ان کے کٹر مذہبی ابا جان صدمے
جاں بلب ہو چکے ہیں۔ خورشید عالم کے خط سے ظاہر تھا کہ وہ بے حد پریشان ہیں۔ جواب میں الماس نے
خود انھیں لکھا۔

"آپ جتنے دن چاہیں وہاں رہئے۔ ڈیڈی آپ کو غیر تو نہیں سمجھتے۔ ہم سب آپ کی پریشا
میں شریک ہیں۔ آپ ابا میاں کو علاج کے لئے یہاں کیوں نہیں لے آتے۔؟"

برسبیل تذکرہ کل میں سوئمنگ کے لئے سن اینڈ سینڈ گئی تھی۔ وہاں ایک بڑی در...
پارسن مس پیروجا دستور سے ملاقات ہوئی جو پیانو بجاتی ہے اور پیرس سے آئی ہے اور...
کسی امریکن کی گرل فرینڈ ہے اور شاید اسی کے ساتھ سن اینڈ سینڈ میں ٹھہری ہوئی ہے۔
آپ کو اس لئے لکھا کہ غالباً آپ بھی کبھی اس سے ملے ہوں پیرس میں۔
اچھا ـــــ اب آپ ابا میاں کو لے کر آجایئے۔ تار دیجئے تاکہ یہاں بریچ کینڈی ہسپتا
میں ان کے لئے کمرہ ریزرو کر لیا جائے۔ ـــــ

آپ کی مخلص ـــــ الماس

شام پڑے تاردیو کی خستہ حال عمارت کے سامنے ٹیکسی آکر رکی اور خورشید عالم باہر اترے
جیب سے نوٹ بک نکال کر انھوں نے پتے پر نظر ڈالی اور عمارت کے لیے سڑک۔ برآمدے کی ڈھنسی ہو
سیڑھی پر قدم رکھا۔ سامنے ایک دروازے کی چوکھٹ پر جنے سے جو "چوک" صبح بنایا گیا تھا
وہ اب تک موجود تھا۔ اندر نیم تاریک کمرے کے سرے پر کھڑکی میں ایک بوڑھا پارسی صدر...
اور میلی سفید پتلون پہنے، سر پر گول ٹوپی اوڑھے، کمر میں بندھی "کستی" کھول کر اس میں گرہیں
لگاتے ہوئے زیر لب دعائیں پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف میلی سی آرام کرسی پڑی تھی۔ وسطی میز پر رنگین
موم جامہ بچھا تھا۔ دیوار پر زرتشت کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ کمرے میں ناریل اور مچھلی کی تیز
باس امڈ رہی تھی۔ ایک بوڑھی پارسن سرخ جارجٹ کی ساری پہنے، سر پر رومال باندھے منڈیا

ہلاتی اندر سے نکلی۔

"مس دستور ہیں"

"پیروجا، پارسن نے دھندلی آنکھوں سے خورشید عالم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ مدہوگئی ہے سینڈ اینڈ سینڈ"

"کیا؟ کیا مس دستور سن اینڈ سینڈ میں منتقل ہوگئی ہیں؟"

بہری پٹ ضعیفہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کس کے ——— کس کے ساتھ ———؟" خورشید عالم نے ہکلا کر پوچھا۔

بوڑھی غڑاپ سے اندر گئی اور ایک وزیٹنگ کارڈ لاکر خورشید عالم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کارڈ پر کسی امریکن کا نام درج تھا۔

"تم مسٹر کھورشیٹ عالم ہو، پیروجا نے کہا تھا کہ تم آنے والے ہو۔ اگر اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آؤ تو میں فوراً اس کو جو ہو فون کر دوں۔ اور تم کو یہ بتاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے" اس نے بلاوز کی جیب سے پیسے نکالے۔ خورشید عالم نے ہکا بکا ہو کر بوڑھی کو دیکھا۔

"آپ کو اس صورت حال پر کوئی اعتراض نہیں؟"

بہری بھنڈ ضعیفہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم بہت غریب لوگ ہیں مگر بس پیروجا کو ایک امریکن ———"

دفعتہ مسز دستور کو یاد آیا کہ انھوں نے مہمان کو اندر ہی نہیں بلایا ہے اور انھوں نے بیٹھو بعد کو کہا۔ "آؤ اندر آجاؤ ———"

خورشید عالم مبہوت کھڑے رہے۔ پھر تیزی سے پلٹ کر ٹیکسی میں جا بیٹھے۔

"بائی بائی" ضعیفہ نے ہاتھ ہلایا۔

بوڑھا پارسی دعا ختم کر کے باہر لپکا مگر ٹیکسی زن سے آگے جا چکی تھی۔

جس روز الماس اور خورشید عالم کی منگنی کی دعوت تھی ایسی ٹوٹ کر بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ اترنے سے ذرا پہلے بارش تھمی اور خورشید عالم اور الماس کے والد کے دوست ڈاکٹر صدیقی جو حال ہی میں تبدیل ہو کر بمبئی آئے تھے، بالکنی میں جا کھڑے ہوئے۔ جس سے کچھ فاصلے پر برج خموشاں کا اندھیرا جنگل بھیگی ہوئی ہوا میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اندر ڈرائنگ روم میں قہقہے گونج رہے تھے اور گرنڈ میا نو پر رکھے ہوئے نقرئی

شمعدان میں موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ بڑا سخت رومینٹک اور پُر کیف وقت تھا۔ اتنے میں گیلری میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک ملازم نے آکر الماس سے کہا "خورشید صاحب کے لئے فون آیا ہے"۔ دلہن بنی ہوئی الماس لپک کر فون پر پہنچی۔ ایک مقامی ہسپتال سے ایک نرس پریشان آواز میں دریافت کر رہی تھی "کیا مسٹر عالم وہاں موجود ہیں؟"

"آپ بتایئے۔ آپ کو مسٹر عالم سے کیا کام ہے؟" الماس نے درشتی سے پوچھا۔

"مس پیرو جا دستور ایک مہینے سے یہاں سخت بیمار پڑی ہیں۔ آج ان کی حالت زیادہ ـــ زیادہ نازک ہو گئی ہے۔ انھوں نے کہلوایا ہے کہ اگر چند منٹ کے لئے مسٹر عالم یہاں آسکیں ......"

"مسٹر عالم یہاں نہیں ہیں"۔

"آر یو شیور۔؟"

"یس، آئی ایم ویری شیور" الماس نے گرج کر جواب دیا "کیا آپ سمجھتی ہیں میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" اور کھٹ سے فون بند کر دیا اور ذرا سراسیمگی سے مہمانوں میں آشامل ہوئی۔

دو گھنٹے بعد پھر فون آیا۔

"ڈاکٹر صدیقی آپ کی کال ـــ گیلری میں کسی نے آواز دی"۔ "آپ کو فوراً ہسپتال بلایا گیا ہے"۔

ڈاکٹر صدیقی بعدی سے ٹیلی فون پر گئے۔ پھر انھوں نے الماس کو آواز دی۔ "بھئی معاف کرنا مجھے، بھاگنا پڑ رہا ہے"۔

الماس دروازے تک آئی "کل ضرور آیئے گا، ہم لوگ ویک اینڈ کے لئے پونا جا رہے ہیں"۔

ضرور ـــ ضرور ـــ گڈ نائٹ ـــ" ڈاکٹر صدیقی نے کہا اور باہر نکل گئے۔

بریچ کینڈی کے ہسپتال میں صحت یاب ہو کر خورشید عالم کے ابا میاں خوش خوش پرتاب گڑھ واپس جا چکے تھے۔ جب ... کمبالا ہل والا فلیٹ تیار نہیں ہوا جو دلہن کو جہیز میں ملا تھا۔ شادی کے بعد دولھا میاں سسرال ہی میں رہے۔ اکثر وہ صبح کو دفتر جانے سے قبل بالکنی میں جا کھڑے ہوتے نیچے پہاڑ کے گھنے باغ میں سے گزرتی بل کھاتی سڑک برج خموشاں کی طرف جاتی تھی۔ وقتاً فوقتاً سفید براق کپڑوں میں ملبوس پارسی نسیاز سفید رومالوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے قطاریں بنائے جنازہ اٹھائے

دور پہاڑی پر چڑھتے نظر آتے۔ کوے اور گدھ درختوں پر منتظر بیٹھے رہتے۔ برج خموشاں کے احاطے کا پھاٹک دور خمیس کار زر پر کھلتا۔ پھاٹک پر ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والا خوفناک بوڑھا پھونس پارسی دربان ساکت بیٹھا رہتا تھا۔ سفید ساریوں اور سفید کپڑوں میں ملبوس سوگوار پارسی "میت چڑھانے" کے بعد سرسبز پہاڑی سے اتر کر اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھ جاتے۔ پھاٹک کے باہر زندگی کا پُر جوش سمندر اسی طرح ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔ مقابل کی عمارت پر ایر انڈیا کے "مہاراجہ" کا اشتہار نت نئے پُر لطف الفاظ میں ان زندہ انسانوں کو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک سے ایک دل چسپ شہروں تک سفر کرنے کی دعوت میں مصروف رہتا۔

"اس" نے ایک بار خط میں لکھا تھا "ذہن کی ہزاروں آنکھیں ہیں۔ دل کی آنکھ صرف ایک ہے لیکن جب محبت ختم ہوجائے تو ساری زندگی ختم ہوجاتی ہے۔"

سمندر کی موج پل کی پل میں فنا ہوگئی۔ آسمان پر سے گذرنے والے بادل فضا میں تحلیل ہوچکے۔ جب وہ مری ہوگی تو کوؤں اور گدھوں نے اس کا کس طرح سواگت کیا ہوگا۔ اس طوفانی رات کو ہسپتال کے وارڈ سے نکل کر اس کی روح جب آسمانوں پر پہنچی ہوگی اور عالم بالا کے گھپ اندھیرے میں کسی دوسری روح نے اس سے ٹکرا کر پوچھا ہوگا "تم کون ہو؟" تو اس نے جواب دیا ہوگا۔

"پتہ نہیں —— میں کل ہی تو مری ہوں۔"

اب تک اس کی روح کہاں سے کہاں نکل گئی ہوگی۔ مرے ہوئے انسان زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں۔

تارا بائی اپنی روشن آنکھوں سے صاحب کے گھر کی ہر چیز کو ارمان اور حیرت سے دیکھتی ہے۔ وہ صاحب کو حیرت سے تکا کرتی ہے۔ الماس بیگم اب امید سے ہیں۔ بہت جلد تارا بائی کا کام دگنا بڑھ جائے گا۔

آج صبح آئی اسپیشلسٹ ڈاکٹر صدیقی آئے تھے۔ جب تارا بائی ان کے لئے چائے لے کر برآمدے میں گئی تو وہ چونک پڑے اور خوشی سے پوچھا "ارے تارا دائی —— تم یہاں کام کر رہی ہو؟"

"جی ڈاکٹر صاحب ——" تارا بائی نے شرما کر جواب دیا۔

"اب صاف دکھائی دیتا ہے؟"

"جی ڈاکٹر صاحب ـــــ اب سب کچھ بہت صاف دکھائی دیتا ہے۔"

"گڈ ـــــ" پھر وہ مسٹر اور مسز خورشید عالم سے مخاطب ہوئے۔ "یہ لڑکی دس سال کی عمر میں اندھی ہو گئی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے اس کا اندھا پن عارضی ثابت ہوا۔ تمھیں یاد ہے الماس تمہاری انگیجمنٹ پارٹی کی رات مجھے ہسپتال بھاگنا پڑا تھا؟ وہاں ایک خاتون مس پیرو جا دستور کا انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے مرنے سے چند روز قبل اپنی آنکھیں آئی بنک کو ڈونیٹ کرنے کی وصیت کی تھی۔ لہٰذا ان کے مرتے ہی مجھے فوراً بلا یا گیا کہ ان کی آنکھوں کے ڈیلے نکال لوں۔ بے حد نرگسی آنکھیں تھیں بے چاری کی۔ جانے کون تھی غریب۔ ایک بہری بھنڈیا پارسن پلنگ کے سرہانے کھڑی بُری طرح رو رہی تھی۔ بڑا المناک منظر تھا ـــــ خیر تو چند روز بعد اس تارا دائی کا ماموں اسے میرے پاس لایا تھا۔ اسے کسی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ نیا کورینا لگانے سے اس بچی کی بینائی واپس آ سکتی ہے۔ میں نے وہی مس دستور کی آنکھیں ذخیرے میں سے نکال کر ان کا کورینا اس لڑکی کی آنکھوں میں گرانٹ کر دیا۔ دیکھو کیسی تارا ایسی آنکھیں ہو گئیں اس کی۔ واقعی میڈیکل سائنس آج کل معجزے دکھا رہی ہے۔"

ڈاکٹر صدیقی نے بات ختم کر کے اطمینان سے سگریٹ جلا لیا ہے۔ مگر الماس بیگم کا چہرہ فق ہو گیا ہے۔ خورشید عالم لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کر جیسے اندھوں کی طرح ہوا میں کچھ ٹٹولتے ٹٹولتے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ تارا بائی ان کی یہ کیفیت دیکھ کر بھاگی بھاگی اندر جاتی ہے، تو صاحب پلٹ کر باؤلوں کی طرح اسے تکنے لگتے ہیں۔ تارا بائی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ بوکھلائی ہوئی باورچی خانے میں جا کر برتن دھونے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ دور برج خموشاں پر اسی طرح گدھ اور کوّے منڈلا رہے ہیں۔

کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس